انوشا پاٹلی پتر میں
محمد یونس حسرت

انوشا کی آپ بیتی

پانچواں حصّہ

انوشا پاٹلی پُتر میں

بچوں کے لئے ناول

محمد یونس حسرت

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

پہلی بار ۱۹۷۹

تعداد ۴۰۰۰

قیمت ۴-۰۰

فہرست

راجا سُدھانند کے محل میں

ہم گیا سے چلے اور مختلف بستیوں اور شہروں سے ہوتے ہوئے پاٹلی پُتر جا پہنچے۔ دریائے گنگا کے کنارے یہ اونچا اور مضبوط قلعہ شِیش ناگ خاندان کے چھٹے راجا اور بمبی سار کے بیٹے اجاتاشترو نے تعمیر کروایا تھا۔

جب اجاتاشترو نے ویسالی اور کوشل کی ریاستوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور ریاست کوسمبی پر حملے کی تیّاریاں شروع کر دیں تو پھر اُس نے ریاست کوسمبی کے علاقے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ مگر اُس نے ابھی

ریاست کوسمبی کے چند علاقوں پر ہی قبضہ کیا تھا کہ ریاست آونتی کا راجا چندا مہاسین کوسمبی کے راجا اودے یان کو جو اُس کا داماد بھی تھا، بچانے کے لیے میدان میں آگیا اور ایک بھاری فوج لے کر مگدھ کی طرف بڑھنے لگا۔

اجاتاشترو اگرچہ ویسالی اور کوشل کی ریاستوں کو فتح کر کے سلطنت میں شامل کر چُکا تھا، لیکن وہاں کے لوگ دل سے اُس کی اطاعت پر راضی نہ تھے۔ اب جو آونتی کے راجا نے مگدھ کی طرف پیش قدمی کی تو اجاتاشترو کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں آونتی، کوسمبی، کوشل اور ویسالی سب مگدھ کے خلاف ایکا نہ کر لیں۔ اِسی خطرے کی بنا پر اجاتاشترو نے کوسمبی پر بھرپور حملے کا خیال چھوڑ کر مگدھ کی حفاظت کی طرف توجّہ کی اور دریائے گنگا کے جنوبی کنارے پر ویسالی کی طرف سے حملے کو روکنے کے لیے پاٹلی پُتر کا مضبوط قلعہ بنوایا۔

اجاتاشترو نے قلعے کی تعمیر کے ساتھ ساتھ جنگی تیّاریاں بھی جاری رکھیں۔ مگر ابھی یہ تیّاریاں مکمّل نہ ہوئی تھیں کہ وہ مر گیا اور اُس کی جگہ اس کا بیٹا دراشک

مگدھ کی راج گدّی پر بیٹھا۔ اُس نے اپنی بہن پدماوتی کی شادی کوسمبی کے راجا اودے یان کے ساتھ کر کے صُلح کر لی اور کوسمبی کے جِن علاقوں پر اجاتا شترو نے قبضہ کر لیا تھا، وہ بھی اودے یان کو واپس دیے۔

اس کے بعد دراشک یا شیش ناگ کے کسی راجا نے اپنے پڑوسی راجاؤں سے لڑائی مول نہیں لی۔ اُنھوں نے راج گڑھ کے بجائے پاٹلی پُتر ہی کو اپنی راجدھانی بنالیا۔ تین سو ساٹھ سال تک نہایت شان و شوکت سے حکومت کرنے کے بعد شیش ناگ خاندان کی گدّی نند خاندان کے قبضے میں آگئی، جب کہ آخری شیش ناگ راجا مہانند کو اُس کے وزیر مہاپدم نند نے قتل کر کے خود حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔

مہا پدم نند کہنے کو ایک نیچ ذات کا تھا، مگر اِس کے باوجود وہ ایک ایسا جنگ جُو حُکمران ثابت ہوا جس نے اِرد گِرد کی تمام ریاستوں کو مگدھ کی سلطنت میں شامل کر لیا اور یوں اُس سلطنت کی حدیں جنوب میں نربدا اور مغرب میں دریائے ستلج

وسیع ہو گئیں۔

اِسی سلطنت کے بارے میں چندر گُپت کے وزیر چانکیہ نے ہمیں بتایا تھا کہ یہ سلطنت اگرچہ ستلج سے لے کر مشرق میں سمندر کے کناروں تک پھیلی ہوئی ہے، لیکن اِس کے پنچ ذات کے راجا سُدھانند کے ظُلم و سِتم سے لوگ تنگ آئے ہوئے ہیں اور دِن رات اُس سے نجات حاصل کرنے کی دُعائیں مانگتے ہیں۔ اور تو اور راجا سُدھانند کا وزیر شکاتولہ بھی اُس سے تنگ ہے۔ راجا نے اُس کے ساتھ کئی زیادتیاں کی ہیں اور وہ اِن زیادتیوں کا انتقام لینا چاہتا ہے۔

اسی انتقام کی خاطر شکاتولہ نے چانکیہ سے امداد چاہی تھی۔ تینوں، سارنگ بابا، اُوشا اور میں، اِسی لیے ٹیکسلا سے چل کر پاٹلی پُتر پہنچے تھے۔ اب ہمیں شکاتولہ سے ملنا تھا اور یہ معلوم کرنا تھا کہ ہمیں کیا کرتا ہے۔ پاٹلی پُتر کا مضبوط قلعہ جو دریائے گنگا کے کنارے واقع تھا، شان و شوکت کے لحاظ سے اپنا جواب آپ تھا۔ یہ قلعہ لمبائی میں آٹھ کوس اور چوڑائی میں ڈیڑھ کوس تک پھیلا ہوا تھا۔ اِس کے چاروں

طرف اُونچی اور مضبوط فصیل تھی۔ اس فصیل میں جگہ جگہ لکڑی کی نوک دار کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں، اور اس میں ۵۷۰ بُرج اور ۶۴ دروازے تھے۔ قلعے کے ارد گرد ایک کھائی کھُدی ہوئی تھی، جس کی چوڑائی کوئی پانچ سو ہاتھ اور گہرائی پچیس ہاتھ تھی۔ کھائی ہر وقت پانی سے بھری رہتی تھی۔ فصیل کے اندر کی طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تیر اندازوں کے لیے چھوٹے چھوٹے مورچے بنے ہوئے تھے، اور اُن مورچوں کے سامنے، فصیل میں، چھوٹے چھوٹے روشن دان تھے۔ تیر انداز اِن مورچوں میں بیٹھ کر دُشمن پر تیروں کا مینہ برسا سکتے تھے۔

قلعے کی فصیل کے اندر پاٹلی پُتر کا شہر تھا اور اِس شہر کے عین درمیان میں راجا سُدھانند کا راج محل تھا۔ شہر کی دوسری بڑی بڑی عمارتوں کی طرح اِس میں بھی لکڑی بہت زیادہ استعمال ہوئی تھی۔ اُس کے اکثر بڑے بڑے کمرے لکڑی کے ستونوں سے سجے ہوئے تھے اور اُن میں سے اکثر ستونوں پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ، ستونوں پر سونے اور چاندی سے خوب صورت پرندوں

کے پَر اور مختلف بیل بُوٹے بنائے گئے تھے۔

راجا کے خزانے تو سونے چاندی سے بھرے ہوئے تھے ہی، اُس کے محل میں بھی سونے چاندی اور دوسری اعلیٰ دھاتوں کے بنے ہوئے خوب صورت اور جگ مگ کرتے برتنوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ شاہی تخت اور وزیروں اور درباریوں کی نشستوں اور سجاوٹ کی دوسری چیزوں میں بھی ہیرے جواہرات اور دوسرے قیمتی پتھّر بڑی کثرت سے استعمال ہوئے تھے۔

راج محل کے اندر ہی ایک لمبا چوڑا باغ تھا۔ اِس باغ میں مور اور دوسرے خُوب صُورت پرندے، اور قِسم قِسم کے نایاب پھولوں اور کھیلوں کے درخت تھے۔ باغ کے اندر جگہ جگہ حوض اور جھیلیں بھی بنائی گئی تھیں، جِن کے لیے پانی دریائے گنگا سے آتا تھا۔ اِن حوضوں اور جھیلوں میں رنگ رنگ کی خوش نما مچھلیاں رکھی جاتی تھیں۔

راج محل کا دربارِ عام دیکھ کر ایک رُعب سا دِل پر چھانے لگتا تھا۔ اُس کی چھت

ستونوں پر قائم کی گئی تھی اور یہ تمام ستون پتھّر کے تھے۔ انہیں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے چبوتروں کے سہارے بنایا گیا تھا۔ سکندر نے ایران کو اپنے قدموں تلے روندنے اور دارا کو شکست دینے کے بعد دارا کے خزانے اور شاہی محل دیکھے تھے تو اُس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئی تھیں۔ اُس نے ایران کی دولت بارہ ہزار خچروں پر لاد کر اپنے وطن مقدونیہ بھیجی تھی۔ شوش اور اکبتانہ کے عالی شان محل دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا، لیکن مُجھے یقین ہے کہ اگر اُس کے سپاہی بیاس کے کنارے آکر آگے بڑھنے سے انکار نہ کر دیتے۔ اور وہ پانی پُتر تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو پانی پُتر کے دولت سے بھرے ہوئے خزانوں اور اُس کے شان دار محلوں کو دیکھ کر وہ دارا کے محلوں اور ایران کی دولت کو بھول جاتا، لیکن پاٹلی پُتر کی یہ دولت سکندر کے نصیب میں نہیں تھی۔

ہم نے پاٹلی پُتر پہنچ کر وہ سرائے تلاش کی جس کا پتا چانکیہ نے دیا تھا۔ یہ سرائے محل کے قریب ہی تھی اور شنکر سرائے کہلاتی تھی۔ اُس کا مالک ایک نیک دِل شخص چندر بھگت تھا۔ اُس نے یہ سرائے اپنے باپ کے نام پر بنوائی تھی۔ جِن

لوگوں کو راجا یا اُس کے کسی درباری سے ملنا ہوتا تھا تو وہ عام طور پر اِسی سرائے میں آکر ٹھہرتے تھے۔ ہم نے رات اُسی سرائے میں بسر کی اور صُبح ابھی اپنے بستروں ہی میں تھے کہ اپنے کمرے کے دروازے پر چندر بھگت اور اُس کے ساتھ راج محل کے ایک چوب دار کو کھڑا پایا۔ چوب دار نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا:

"سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا، آپ ہی ہیں مہاراج؟"

"ہاں،" سارنگ بابا نے جواب دیا۔

"مہاراج نے آپ کو بُلایا ہے۔" چوب دار نے کہا۔ "ابھی چلیے۔"

مُجھے سخت حیرانی ہو رہی تھی لیکن حیرت ظاہر کرنے کا یہ موقع نہ تھا۔ ہم جلدی جلدی تیّار ہوئے اور چوب دار کے ساتھ ہو لیے۔

میرا ذہن بُری طرح سوچ میں کھویا ہوا تھا کہ راجا سُدھانند کو ہماری خبر کیسے ہو

گئی! ہم توشکاتولہ سے ملنے آئے تھے اور ابھی اُس سے ملنے کی سوچ ہی رہے تھے۔

مختلف بر آمدوں اور راہداریوں سے گُزرتے ہوئے ہم راجا سُدھانند کے دربار میں پہنچے۔ وہاں اُس کے تمام وزیر اور درباری جمع تھے۔ یہ اُس کا دربارِ عام نہیں تھا، دربارِ خاص تھا، جہاں وہ اور اُس کے درباری خاص خاص موقعوں پر جمع ہوتے تھے۔ آج بھی راجا سُدھانند اور اُس کے درباری ایک خاص ضرورت کے تحت یہاں جمع تھے، اور رات بھر ایک ایسے مسئلے پر سوچ بچار کرتے رہے تھے جس نے اُنہیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

ایک ایسا واقعہ پیش آگیا تھا جس نے مگدھ کی ساری سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ واقعہ پاٹلی پُتر میں نہیں، بلکہ پاٹلی پُتر سے کئی ہزار میل دور کوروکشیتر سے ذرا آگے مارکنڈا ندی کے کنارے پیش آیا تھا۔ لیکن اِس واقعے نے رانا سُدھانند اور اُس کے درباریوں کے دِل یوں ہلا دیے تھے جیسے یہ واقعہ خود راج محل کی اُونچی اُونچی دیواروں تلے پیش آیا ہے۔

مارکنڈا وہ خُونی ندی تھی جسے لوگ مقدس سمجھتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ ندی اصل میں خُون کی پیاسی دُرگا دیوی کا ایک روپ ہے۔ اِس ندی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہر سال آٹھ دس جوانوں کے خُون کی بھینٹ لیتی ہے لیکن اب کے مارکنڈا نے آٹھ دس کے بجائے آٹھ دس ہزار جوانوں کے خُون کی بھینٹ لے لی تھی اور یہ آٹھ دس ہزار جوان مگدھ کی فوج کے سپاہی تھے۔

مارکنڈا کے کنارے سے کوئی پانچ کوس شمال کی طرف ایک مندر تھا جسے ساندل متی کہا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِس مندر نے ایک مضبوط قلعے کی شکل اختیار کرلی تھی اور یہ قلعہ پاٹلی پُتر یا کسی دوسرے قلعے سے کم مضبوط نہ تھا۔ یہاں راجا کی طرف سے ایک حاکم مقرّر ہوتا تھا اور اُس کے ماتحت کئی ہزار سپاہی ہوتے تھے جن کا کام قلعے کی حفاظت کرنا تھا۔

راجا سُدھانند کی طرف سے اِس قلعے پر جو شخص حاکم مقرّر کیا گیا تھا اُس کا نام سری چند تھا۔ وہ ظاہری طور نند خاندان کے راجا کا وفادار تھا مگر اُس کی دِلی

ہمدردیاں شیش ناگ خاندان کے ساتھ تھیں۔ اِس لیے جب سکندر کی واپسی کے بعد دریائے سندھ اور دریائے بیاس کے درمیانی علاقے میں چندر گُپت کی حکومت قائم ہو گئی تو سِری چند نے سُدھانند کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے چندر گُپت کے ساتھ وفاداری کا اظہار کر دیا۔

سِری چند کی بغاوت کی خبر جلد ہی پاٹلی پُتر جا پہنچی۔ کیوں کہ سلطنت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک راجا کے جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا تھا جِن کے ذریعے ساری خبریں اُسے پہنچتی رہتی تھیں۔ سِری چند کی بغاوت کی خبر ملتے ہی راجا سُدھانند نے اپنے ایک جرنیل بدھ شالہ عرف چتر بودھ کو فوج دے کر بھیجا کہ وہ سِری چند کو اُس کی بغاوت کا مزا چکھائے اور اُسے ایسی سزا دے کہ اُس کی سات پُشتیں یاد رکھیں۔

چتر بودھ کی فوج میں کوئی دس ہزار سپاہی تھے۔ اُس فوج کے ساتھ چتر بودھ پاٹلی پُتر سے روانہ ہوا اور بجلی کی سی تیزی سے، منزلوں پر منزلیں مارتا، مارکنڈ اندی

کے کنارے جا پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی اُس نے سانڈل متی کا محاصرہ کر لیا۔

سانڈل متی کے مضبوط قلعے کو فتح کرنا کُچھ آسان نہ تھا۔ یہ بات سِری چند کو اچھّی طرح معلوم تھی اور چتر بودھ بھی اِس سے بے خبر نہ تھا۔ اُس نے محاصرہ اِس ارادے سے کیا تھا کہ وہ اِس وقت تک اُسے گھیرے رکھے گا جب تک سِری چند اور اُس کے سپاہی تنگ آکر ہتھیار نہ ڈال دیں۔

اِس مقصد کے لیے چتر بودھ نے آس پاس کے تمام ایسے راستوں پر اپنے سپاہی بٹھا دیے تھے جہاں سے کوئی سامان یا کوئی چیز قلعے کے اندر جا سکتی تھی۔ اگرچہ قلعے کے اندر کھانے پینے کا کافی سامان موجود تھا لیکن یہ ہمیشہ کے لیے کافی نہیں ہو سکتا تھا۔ چتر بودھ کو اُمّید تھی کہ اب قلعے کے اندر خوراک کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا اور سپاہی بھوک پیاس کے ہاتھوں لاچار ہو جائیں گے تو اُن کے لیے سوائے ہتھیار ڈالنے کے اور کوئی چارہ نہ رہے گا۔

محاصرہ بہت دِنوں تک جاری رہا مگر سانڈل متی کے سِری چند اور اُس کے سپاہیوں

نے ہمّت اور حوصلے سے کام کیا۔ وہ محاصرے کی سختیاں اور تکلیفیں برداشت کرتے ہے۔ لیکن اُنہوں نے چتر بودھ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔

پھر شیش ناگ کا بیٹا چندر گُپت پچھّم کی طرف سے اپنی فوج لے کر چلا اور مار کنڈا ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ اُس نے اپنے سپاہیوں کو اُس ندی کے کنارے دور تک اُگی ہوئی گھنی جھاڑیوں کے جنگل میں اِس طرح چھُپا دیا کہ چتر بودھ اور اُس کے سپاہیوں کو پتانہ چلنے پائے۔

چتر بودھ نے اگرچہ سانڈل متی کی طرف جانے والے تمام راستوں پر پہرا بٹھا دیا تھا لیکن ایک خُفیہ راستہ ایسا تھا جو اُس کے عِلم میں بھی نہیں تھا۔ چندر گُپت نے اپنے ایک ہوشیار اور چالاک افسر پدم کو ایک پیغام دے کر اُسی خفیہ راستے سے سانڈل متی کے قلعے میں بھیجا۔ پدم پوشیدہ طور پر قلعے میں داخل ہوا اور چندر گُپت کا پیغام سِری چند کو پہنچا کر اُسی طرح پوشیدہ طور پر واپس آ گیا۔ چتر بودھ اور اُس کے سپاہیوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس پیغام کے ذریعے چندر گُپت نے

سِری چند کو اپنے حملے کے وقت سے آگاہ کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا:

"میری فوج آدھی رات کے بعد چتر بودھ کی فوج پر پیچھے سے حملہ کرے گی۔ ٹھیک اُسی وقت تُم بھی قلعے کا دروازہ کھول کر اپنے سپاہیوں کے ساتھ باہر آجانا، اور چتر بودھ اور اُس کے سپاہیوں پر سامنے سے حملہ کر دینا۔

رات کے وقت حملے کا یہ داؤ چندر گُپت نے یونانیوں سے سیکھا تھا۔ یہاں کے راجاؤں میں ایسی کوئی روایت نہیں تھی۔ جنگ ہو یا امن، اُن کے نزدیک رات صرف آرام کے لیے تھی۔ لڑائی کے میدان میں دِن بھر لڑتے رہنے کے بعد شام ہوتے ہی وہ جنگ بند کر دیتے تھے۔

مگر چندر گُپت نے سکندر کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ وہ سکندر کی لڑائی کے بہت سے داؤں پیچ اپنا چُکا تھا، اور دُشمن پر رات کے وقت بے خبری کی حالت میں حملہ کرنا بھی اُن میں سے ایک تھا۔

مقرّرہ وقت پر چندر گُپت کی فوج مارکنڈ اندی کے آس پاس کی جھاڑیوں سے نکلی

اور چتر بودھ کی فوج کے پیچھے پہنچ گئی۔ اِس کے ساتھ ہی سِری چند قلعے کا دروازہ کھول کر اپنے سپاہیوں کے ساتھ چتر بودھ کی فوج کے سامنے آگیا۔

چتر بودھ کی فوج اپنے دُشمن کی چالوں سے بے خبر، بڑے آرام سے نیند کے مزے لے رہی تھی۔ یکایک آگے اور پیچھے کی طرف سے ایک ساتھ حملہ ہوا تو سپاہی ہڑبڑا کر اُٹھے اور اپنے اپنے ہتھیار سنبھالنے گئے مگر اِس سے پہلے کہ وہ ہتھیار لے کر مُقابلے پر آسکتے چندر گُپت اور سِری چند کی فوج نے اُن میں سے بہت سوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اِس مقابلے میں چتر بودھ کو بھی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

اِس کے بعد چتر بودھ کے سپاہیوں میں وہ بھگدڑ مچی کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ کتنے ہی سپاہی ایسے تھے جن کی نیند چندر گُپت کے سپاہیوں کے ہاتھوں موت کی نیند میں بدل گئی۔ کتنے ہی مُقابلے میں کھیت رہے اور کتنے ہی ایسے تھے کہ جنھوں نے اپنی جانیں بچانے کے لیے مارکنڈا کی خُونی ندی میں چھلانگ لگا دی۔

صرف گنتی کے چند سپاہی ایسے تھے جو زندہ بچ کر دوسرے کنارے پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ باقی سب کو مارکنڈا کی خُونی لہروں نے نِگل لیا۔ اِس طرح مارکنڈا ندی نے آٹھ دس جوانوں کے بجائے دس ہزار جوانوں کے خُون کی بھینٹ لے لی تھی۔ اور یہ سب، جوان مگدھ کی فوج کے سپاہی تھے۔

چتر بودھ اور اُس کی فوج کا یوں خاتمہ کرنے کے بعد چندر گُپت ایک شان کے ساتھ سانڈل متی کے قلعے میں داخل ہوا۔ مگدھ کی سلطنت کی حد میں داخل ہونے کے بعد یہ اُس کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔ اُس نے سری چند اور اُس کے سپاہیوں کو اِس وفاداری کے بدلے میں بھاری انعامات دیے اور قلعے پر شیش ناگ خاندان کا جھنڈا لہرا دیا۔ چندر گُپت نے چند دِن سانڈل متی میں آرام کیا اور پھر ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ آگے بڑھا۔

مارکنڈا ندی کے کنارے، سانڈل متی سے آئی ہوئی یہی وہ خبر تھی جو راجا سُدھانند اور اُس کے درباریوں کے ہوش و حواس پر بجلی بن کر گِری تھی اور اُس

نے اُنہیں یوں ہلا کر رکھ دیا تھا جیسے یہ واقعہ خود پاٹلی پُتر کی اُونچی اُونچی دیواروں تلے پیش آیا ہے۔ یہ خبر سُنتے ہی راجا سُدھانند نے اپنے تمام درباریوں کو بلوالیا تھا اور وہ ساری رات آپس میں مشورہ کرتے رہے تھے، مگر ابھی تک کسی نتیجے، کسی فیصلے پر نہیں پہنچے تھے۔ پھر راج محل کے چوب دار نے ہم تینوں کو راجا سُدھانند کے سامنے پیش کیا۔ ہم نے اب تک چھوٹے بڑے کئی راجاؤں کے دربار دیکھے تھے، اور سب سے بڑھ کر اُس سکندر کو بھی دیکھا تھا جس نے اُن سب راجاؤں کے تخت اور تاج اپنے قدموں تلے روند ڈالے تھے، مگر راجا سُدھانند کا دربار خاص اپنی سجاوٹ اور ٹھاٹھ باٹھ کے لحاظ سے اپنا جواب آپ تھا اور ہوتا بھی کیوں نہ۔ مگدھ کی سلطنت مغرب میں دریائے ستلج سے مشرق میں سمندر کے پانیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اب ستلج سے لے کر مارکنڈا ندی تک کا علاقہ شیش ناگ کے بیٹے چندر گُپت کے قبضے میں جا چُکا تھا۔ راجا سُدھانند پورے رُعب داب کے ساتھ راج گدی پر بیٹھا تھا۔ دربار کی سجاوٹ اور راجا کے لباس اور تاج میں ٹنگے ہوئے ہیرے دیکھنے والوں کی نظروں میں چکا چوند پیدا کرتے تھے۔

مگر سارے رُعب داب کے باوجود اُسے دیکھ کر میرے دل پر وہ اثر نہیں ہوا جو راجا پورس کو دیکھ کر ہوا تھا۔

پورس کا اونچا لمبا قد اور گٹھا ہوا بھاری جسم دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں عقاب کی سی تیزی تھی اور اُس کا چوڑا چکلا چہرہ یوں لگتا تھا جیسے کوئی شیر اپنے شکار پر جھپٹا چاہتا ہے۔

میں نے سکندر کو بھی دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر راجاؤں کا سا ظاہری رُعب داب تو نہ تھا لیکن اُس کی نیلی آنکھیں اپنے اندر کُچھ اور ہی اثر رکھتی تھیں، اور اُنہیں دیکھتے ہوئے مُجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں اپنے سامنے شیش ناگ کی تیلی آنکھیں دیکھ رہا ہوں۔

مگر راجا سُدھانند میں سکندر یا پورس کی سی کوئی بات نہ تھی۔ حال آں کہ یہ وہ راجا تھا جس کی فوجی طاقت نے سکندر کے سپاہیوں کے دِلوں پر خوف بِٹھا دیا تھا جس کے متعلّق اُنہوں نے سُنا تھا کہ اس کے پاس چاندی سونے سے بھرے

ہوئے خزانے ہیں، چھ ہزار ہاتھی ہیں، آٹھ ہزار جنگی رَتھ ہیں، اسّی ہزار گھُڑسوار ہیں اور دو لاکھ سپاہی ہیں۔ اور یہ سب کُچھ سُن کر بھی سکندر کے سپاہیوں نے دریائے بیاس سے آگے جانے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ بیاس سے آگے راجا سُدھانند کی فوجی طاقت کے روپ میں اُنہیں اپنی موت دِکھائی دے رہی تھی، اور سکندر مشرق کے سمندر تک پہنچنے کا ارمان اپنے سینے میں دبائے بیاس کے کناروں سے واپس ہو گیا تھا۔

میں راجا سُدھانند کی طرف دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ شکل و صورت سے وہ راجا بالکل نہیں لگتا تھا جس کی طاقت سے سکندر کے سپاہی کانپ اُٹھے تھے۔ اپنے تمام ظاہری رُعب داب کے باوجود راجا سُدھانند کے چہرے سے کمینگی سی ٹپکتی تھی۔ اُسے اور اُس کے درباریوں کو دیکھ کر مجُھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چند بھیڑیے ہیں جو بارش اور طوفان سے بچنے کی خاطر ایک غار میں جمع ہوئے ہیں اور اب اِس انتظار میں ہیں کہ کب کوئی بھیڑیا اُونگھنے لگے اور وہ اُس پر حملہ کر کے اُس کی تِکّا بوٹی کر ڈالیں۔

”مہاراج! سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا حاضر ہیں۔“ چوب دار کی اِس آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ ہم نے تین بار جھُک کر راجا سُدھانند کو آداب کیا اور خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ راجا سُدھانند نے ایک نظر ہم تینوں پر ڈالی اور پھر کہنے لگا:

”تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“

سارنگ بابا نے جھُک کر آداب بجا لانے کے بعد کہا۔ ”کشمیر سے آ رہے ہیں مہاراج۔ راجا پرجا سب کی سیوا کرتے، پھِرتے پھراتے، یہاں تک آ پہنچے۔ اب آگے جہاں قسمت لے جائے۔“

یہ سُن کر راجا سُدھانند اپنی داہنی طرف بیٹھے ہوئے یک شخص سے مخاطب ہوا: ”شکاتولہ! کیا یہی ہیں وہ لوگ ہیں جِن کے بارے میں تُم نے ہمیں بتایا تھا؟“

شکاتولہ کا نام سُن کر ہم چونکتے۔ یہی وہ شخص تھا جس کی امداد کے لیے ہم یہاں تک آئے تھے۔ وہ فوراً اپنی کُرسی سے اُٹھ کر راجا سُدھانند کے سامنے آیا اور جھُک کر آداب بجالانے کے بعد کہنے لگا:

”ہاں مہاراج! یہی وہ سارنگ بابا اور انوشا مہاراج ہیں جنہوں نے رانی چندا کے کہنے پر ایک ہاتھی کو سونے کا بنا دیا تھا اور ایک مُردہ نوجوان کے جسم میں سانپ کی روح ڈال کر اُسے زندہ کر دیا تھا۔“

”اچھا!“ راجا سُدھانند نے حیرت سے کہا۔ ”پھر تو یہ بہت کام کے لوگ ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے راجا نے ایک بار پھر ہماری طرف دیکھا۔ لیکن پہلے کی طرح سرسری نظر سے نہیں بلکہ گہری نظر سے اور پھر اُس کی نگاہیں سارنگ بابا اور میرے چہرے سے ہوتے ہوئے اُوشا کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

”اور یہ لڑکی کون ہے؟“

اِس سے پہلے کہ شکاتولہ راجا سُدھانند کو کُچھ جواب دیتا، اُوشا بول اُٹھی۔ ”میں شیش ناگ کی بیٹی ہوں۔“

یہ الفاظ سُن کر راجا سُدھانند راج گدّی پر یوں اُچھلا جیسے اُسے سچ مُچ کسی شیش

ناگ نے ڈس لیا ہو۔ وہ غصّے سے دھاڑا۔ ”لیا۔۔۔۔ کہا؟“

”مہاراج!“ شکاتولہ نے جلدی سے کہا۔ ”یہ پاٹلی پُتر کے نہیں پشکلاوتی کے شیش ناگ کی بیٹی ہے۔“

”پشکلاوتی!“ راجا سُدھانند اور بھی حیران ہو گیا۔ شاید وہ یہ نام پہلی بار سُن رہا تھا۔

”کہاں ہے یہ پشکلاوتی؟“

”یہاں سے بہت دور پچھّم کی طرف۔“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”دریائے ستلج سے آگے، راوی، چناب، جہلم کے دریاؤں سے بھی آگے، دریائے سندھ کے پار، جہاں گندھرو قوم مختلف قبیلوں کی صورت میں آباد تھی۔ اب وہاں کُچھ بھی نہیں رہا۔ سکندر نے وہ علاقہ تباہ و برباد کر دیا ہے لیکن ایک وقت تھا جب اُس کا باپ پشکلاوتی کے شیش ناگ کے مندر کا پروہت ہوا کرتا تھا۔“

”ہوں۔“ راجا سُدھانند نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”تو یہ لڑکی پشکلاوتی کے شیش

ناگ کی بیٹی ہے۔"

"ہاں، پشکلاوتی کے شیش ناگ کی بیٹی! تو ناچنا بھی جانتی ہے؟"

اُوشا یہ سُن کر تلملا سی گئی اور بڑے غصّے سے کہنے لگی۔ "مگدھ کا راجا اُوشا سے یہ پوچھتا ہے کہ کیا تُو ناچنا بھی جانتی ہے؟ کیا اُسے کسی نے نہیں بتایا کہ اُس کے سامنے وہ اُوشا کھڑی ہے جس کا ناچ دیکھنے کی حسرت دِل میں لیے سکندر اِس دُنیا سے چلا گیا؟"

اُوشا کے یہ الفاظ سُن کر دربار میں سنّاٹا چھا گیا۔ راجا سُدھانند کو اِس انداز میں مخاطب کرنے کی جرأت کسے ہو سکتی تھی لیکن اُوشا پھر اُوشا تھی۔ وہ یہی سوال پوچھنے پر سکندر کو بھی اِسی انداز میں مخاطب کر چکی تھی۔

سب درباری خوف بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید اُن کو یقین تھا کہ راجا غصّے میں آ جائے گا اور پھر سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا تینوں کو قید میں ڈالنے حکم دے گا۔

راجا سُدھانند کی نظریں برابر اُوشا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ غصّے میں نہیں آیا۔ اچانک اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ اُبھری اور وہ بڑے اطمینان سے کہنے لگا:

"تُو تو سچ مُچ ناگن ہے! سکندر تیرا ناچ نہیں دیکھ سکا لیکن ہم دیکھیں گے۔۔۔ ضرور دیکھیں گے۔۔۔۔ آج ہی دیکھیں گے۔۔۔۔۔"

اور پھر وہ شکاتولہ سے بولا۔ "شکاتولہ! یہ تینوں ہمارے مہمان ہیں۔ اُنہیں نہایت عزّت اور آرام سے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا جائے۔"

"جو حکم مہاراج!" شکاتولہ جھُک کر آداب بجالایا۔ اِس کے بعد راجا سُدھانند نے اُوشا سے کہا۔ "پشکلاوتی کی ناگن! ہم آج شام تیرا ناچ دیکھیں گے۔۔۔۔۔ یہیں۔۔۔ اِسی جگہ۔"

اُوشا کُچھ کہنے کے بجائے صرف جھُک کر آداب بجالائی۔

”آیئے مہاراج!“ شکاتولہ نے ہم سے کہا۔

اور پھر وہ ہم تینوں کو لے کر شاہی مہمان خانے کی طرف چل دیا۔

اُوشا اور وجے نند

شاہی مہمان خانے میں ٹھہرنا ہمارے لیے کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اِس سے پہلے ہم کتنے ہی راجاؤں کے مہمان خانوں پہلے میں ٹھہر چکے تھے۔ لیکن یہاں حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہ شکاتولہ جس کی خاطر ہم پاٹلی پُتر آئے تھے اور جس نے راجا سُدھانند کو ہمارے بارے میں بتایا تھا، اُس نے دربار سے لے کر مہمان خانے تک ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ بس وہ خاموشی کے ساتھ سر جھکائے آگے آگے چلتا ہوا ہمیں مہمان خانے تک لایا اور نگران کے حوالے کر کے اُلٹے پاؤں واپس ہا گیا۔

نگرانوں نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر اُٹھانہ رکھی کیوں کہ اُنہیں پہلے سے معلوم تھا کہ اس مہمان خانے میں صرف اُن لوگوں کو ٹھہرایا جاتا ہے جو راجا کے خاص مہمان ہوتے ہیں، مگر اِس تمام خاطر تواضع کے باوجود میں دِل ہی دِل میں شکاتولہ کے رویّے کے متعلّق حیران ہو رہا تھا۔ ہمارے آنے سے پہلے ہی اُس نے ہمارے بارے میں راجا سُدھانند کو بتادیا تھا۔ اِس سے یہی خیال ہوتا تھا کہ چانکیہ نے اُسے کوئی اطلاع ہمارے متعلّق پہنچادی ہے۔ لیکن اُس نے جو خاموشی اختیار کرلی تھی، اُس نے ہمیں اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ اِسی لیے ہم بھی اُس سے کوئی بات نہیں کر سکے تھے۔

دوپہر کے قریب ہمیں پتا چلا کہ راجا سُدھانند نے اپنے درباریوں سے مشورہ کر کے، چندرگُپت کے مُقابلے کے لیے پچاس ہزار سپاہیوں کا لشکر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے جو اُس کے بیٹے ویرانند کے ماتحت ہوگا۔

پھر راج محل سے ایک آدمی اُوشا کے لیے رنگ برنگ اور چمکتے دمکتے کپڑوں کے

کئی جوڑے لے کر پہنچ گیا۔ اُس کے ساتھ ہی ایک اور آدمی ہمارے لیے درباری لباس لے آیا۔ ہم اِن زرق برق کپڑوں کو بڑی تک اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، اور آخر شام کے قریب اِن لباسوں میں دربار خاص میں پہنچ گئے، جہاں راجا سُدھانند نے اُوشا کا ناچ دیکھنے کی بات کی تھی۔

کہنے کو یہ وہی دربارِ خاص تھا جسے ہم نے صُبح کے وقت دیکھا۔ اِس وقت بھی اُس کی سجاوٹ اور ٹھاٹھ باٹھ سے آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوتی تھی۔ لیکن اب تو بات ہی کُچھ اور تھی۔ اِس سجاوٹ نے پہلی سجاوٹ کو مات کر دیا تھا۔ بڑے بڑے خوب صورت فانوسوں میں جلتی ہوئی ہزاروں مومی شمعوں نے دربارِ خاص کی رونق کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

راجا سُدھانند سمیت وہ تمام اشخاص اِس دربار میں موجود تھے جنھیں ہم نے صُبح کے وقت یہاں دیکھا تھا۔ مگر اُن کے علاوہ پچاس کے قریب ناچنے والی لڑکیاں بھی موجود تھیں۔

اِن لڑکیوں کو دیکھ کر اُوشا کے تن بدِن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ سیدھی راجا سُدھانند کی طرف بڑھی اور غصّے سے کہنے لگی۔

''کیا مگدھ کا راجا میرا ناچ دیکھنا چاہتا ہے، یا میرا اور اِن پُتلیوں کا مُقابلہ کرانا چاہتا ہے؟''

راجا سُدھانند نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ ''راج محل میں جب بھی ناچ رنگ کا موقع آتا ہے، اُنہیں ضرور بُلوایا جاتا ہے۔ اِسی لیے اب بھی یہ سب یہاں موجود ہیں، ورنہ ہم تو تمہارا ناچ دیکھنا چاہتے ہیں۔''

اُوشا نے کہا۔ ''میں مُقابلے سے نہ گھبراتی ہوں اور نہ ڈرتی ہوں۔ میں تو۔۔۔۔۔'' وہ کُچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ سارنگ بابا نے آگے بڑھ کر اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اُس کا بازو تھام کھینچتے ہوئے بولے۔ ''اُوشا بیٹی، تُم بھُول رہی ہو کہ ہم یہاں کس حیثیت سے آئے ہیں۔ آؤ، چل کر اپنی جگہ بیٹھو۔ جب حُکم ہو گا، تب اپنا ناچ دکھانا۔۔۔۔۔ آؤ۔''

اور وہ اُوشا کو گھسیٹتے ہوئے ساتھ لے گئے۔ ہم اُن کُرسیوں پر جا بیٹھے جو ہمارے لیے مقرّر تھیں۔

ہم بیٹھ گئے تو اُن لڑکیوں نے ناچنا شروع کیا۔ پہلے چند لڑکیاں ایک ایک کر کے تھوڑی دیر کے لیے ناچیں اور ٹولیوں کی صورت میں ناچنے لگیں۔ اُوشا کُچھ دیر تک تو اپنے آپ پر جبر کیے بیٹھی رہی لیکن پھر اُس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ بجلی کی طرح اپنی جگہ سے اُٹھی، میری طرف دیکھا، اور ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے اُن لڑکیوں کے درمیان پہنچ گئی۔

میں نے سارنگ بابا کی طرف دیکھا اور اُن کی اجازت پا کر اپنے گلے میں جھُولتے ہوئے شانی کو اُن کے حوالے کر کے اُوشا کے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ اُوشا لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی:

"انوشا مہاراج بین بجائیں گے اور ہم سب اُس کی دُھن پر ناچیں گے۔"

اُوشا نے مجھے اشارہ کیا تو میں نے بین بجائی شروع کی۔ تھوڑی دیر تک میں ایک

عام سی دُھن بجاتا رہا اور پھر مہا تالی چھیڑ دی۔

اُوشا کے ناچ کی تیزی دیکھ کر اُس کے گرد گھڑی ہوئی لڑکیاں حیرانی سے مُنہ کھولے رہ گئیں۔ پھر اُنھوں نے جلدی جلدی اپنی حیرت پر قابو پایا اور میری بین کی دُھن پر ناچنے لگیں۔

یہ لڑکیاں اگرچہ اُوشا کی سنگت میں ناچ رہی تھیں مگر اُن کے ناچ میں اُوشا کی سی تیزی نہیں تھی مگر اِس کے باوجود وہ یوں ناچ رہی تھیں جیسے اُوشا کے ناچ نے اُنہیں بھی اپنے طلِسم میں جکڑ رکھا ہے۔

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی کہ اچانک لڑکیوں کو اپنے درمیان ایک سانپ نظر آیا۔ اُن میں بھگدڑ سی مچ گئی اور وہ سانپ سانپ پکارتی ہوئی بھاگ اُٹھیں۔ درباریوں میں بھی ہل چل سی مچ گئی اور کئی لوگ اُس سانپ کی طرف دوڑے جو اُنہیں لڑکیوں کے درمیان نظر آیا تھا۔ یہ کوئی ہاتھ بھر کا سانپ تھا اور شمعوں کی روشنی میں اُس کی جلد چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ میں نے اُس سانپ کو ہاتھ

کو پہچان لیا تھا۔ یہ امبر تھا۔ اُوشا کا پالتو سانپ!

امبر سیدھا اُوشا کی طرف آیا اور اُس کی دائیں پنڈلی پر ڈس لیا۔ سبھی لوگ یہ منظر حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ سانپ کو اُوشا کی پنڈلی پر ڈستے دیکھ کر کئی ایک کی چیخیں نکل گئیں۔ خود راجا سُدھانند گدّی پر اُچھل پڑا۔

میرے اور اُوشا کے لیے جیسے بات ہی کُچھ نہ تھی۔ میں اسی طرح بین بجاتا رہا اور اُوشا نے اُسی طرح ناچتے ناچتے ذرا جھُک کر امبر کو اُٹھایا اور اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر وہ امبر کو اپنے ہاتھ میں لیے پہلے کی طرح ناچنے لگی۔ پچاس کی پچاس لڑکیاں اُوشا کی طرف یوں دیکھ رہی تھیں جیسے اُنہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ راجا سُدھانند اور اُس کے درباری یوں اُوشا کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔ سب کی نگاہوں کے سامنے اُوشا کو سانپ نے ڈس لیا تھا مگر اُس کا کوئی اثر اُوشا پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔

یکایک ایک بھاری بھر کم آواز گونجی:

"مہاراج!"

اور اِس آواز کے ساتھ ہی راجا سُدھانند اور اس کے درباریوں کی نظریں دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایک بھاری بھرکم جوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر آیا اور اپنے اردگرد نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگا:

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، مہاراج؟"

پھر وہ سیدھا ہماری طرف آیا اور حکم دینے کے انداز میں بولا۔ "بند کرو یہ ناچ!"

اُس نوجوان کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ اُوشا جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی ہو گئی اور میری بین خود بخود میرے ہونٹوں سے الگ ہو گئی۔ مگر وہ بھاری بھرکم جوان ہماری طرف دیکھے بغیر راجا سُدھانند کی طرف مُڑا اور اُس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"مہاراج! مُجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ چندرگُپت سے مُقابلے کے لیے فوج بھیجنے

کے بارے میں صلاح مشورے کر رہے ہیں۔ میں اپنے شکار کو ادھورا چھوڑ کر دو دِن اور دو راتیں لگاتار سفر کر کے یہاں پہنچا لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ جنگی صلاح مشورے کرنے کے بجائے ناچ رنگ سے دِل بہلانے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ اور یہ لڑکی کون ہے؟ میں اِسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں؟"

اور پھر وہ راجا سُدھانند کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہماری طرف مُڑا اور اُوشا کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کا ہاتھ کون ہے تو؟"

اور اُوشا نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑالیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی:

"تو کون ہے جو شیش ناگ کی بیٹی کو اِس طرح مخاطب کرنے کی جرأت کر رہا ہے؟"

نوجوان حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر اُس کی نظر اُوشا کے ہاتھ میں لہراتے ہوئے سانپ پر پڑی اور وہ آگے بڑھ کے بجائے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ خوف کے سائے اس کی آنکھوں میں لہرانے لگے۔ وہ کانپتی ہوئی سی آواز میں بولا:

”کون ہے تُو جو ایسا زہریلا سانپ لے کر یہاں آئی ہے؟ یہ تو ایسا مُوذی سانپ ہے جس کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔ جلدی بول، ورنہ میں ابھی تیرا سر تن سے جُدا کر دوں گا۔“

اور اُس نے سچ مُچ پیچھے ہٹ کر میان سے تلوار نکال لی۔ تلوار کی چمک مومی شمعوں کی روشنی میں بجلی طرح کوند گئی۔

”اِدھر آؤ، وجے!“ راجا سُدھانند کی آواز گونجی۔ راجا کی آواز پر نوجوان اُس کی طرف مُڑا اور بولا۔ ”جی، مہاراج!“

راجا سُدھانند نے ہاتھ بڑھا کر تلوار اُس کے ہاتھ سے چھین لی اور کہنے لگا۔ ”تُم نے ایک مرتبہ پھر ثابت کر دیا ہے کہ تُم میرے سب سے بڑے بیٹے ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے بڑے بے وقوف بھی ہو، اِسی لیے میں نے ذمّے داری تمھیں سونپنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچا ہے۔ تُم جنگی صلاح مشوروں میں شامل ہونے کے لیے اپنے شکار کی مُہم کو ادھورا چھوڑ کر یہاں آئے تھے، لیکن ہم

تمہارے آنے سے کافی دیر پہلے اِس بات کا فیصلہ کر چکے ہیں، پچاس ہزار سپاہی چندر گُپت کے مُقابلے کے لیے بھیجے جا رہے ہیں، اور وہ تمہارے چھوٹے بھائی ویرانند کے ماتحت ہوں گے۔ رہی یہ لڑکی، تو اِس کا نام اُوشا ہے اور سارنگ بابا اور انوشا کے ساتھ آئی ہے۔ سارنگ بابا اور انوشا مہاراج کے بارے میں شکاتولہ نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پرور پُور کی رانی چندا کے کہنے پر ایک ہاتھی کو سونے کا بنا دیا تھا اور ایک مُردہ نوجوان کے جسم میں ایک سانپ کی روح ڈال کر زندہ کر دیا تھا۔۔۔۔۔" "سونے کا ہاتھی تو مُجھے بھی چاہیے، مہاراج۔" نوجوان وِجے نند نے کہا۔

"تو اِس کے لیے سارنگ بابا سے بات کرنا۔ شاید وہ مان جائیں۔ پر تُو تو اُوشا کی گردن اُڑا دینے کی دھمکی دے رہا ہے۔ تیری بات کو سارنگ بابا کیسے مانیں گے؟"

"میں اُنہیں مناؤں گا، مہاراج۔" نوجوان وِجے نے کہا۔ "کہاں ہیں وہ؟"

"وہ رہے۔" راجا سُدھانند نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان وجے چھلانگ لگا کر سارنگ بابا کے پاس پہنچا اور اُن کے قدموں میں گِر کر گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگا:

"مہاراج! کیا آپ مجُھے سونے کا ہاتھی بنا کر نہیں دیں گے؟"

اُس کے لہجے میں ایسی منّت اور سماجت تھی جیسے کوئی بچّہ اپنے ماں باپ سے کسی کھلونے کے لیے ضد کر رہا ہو۔ راجا اور تمام درباری اُس کی اِس حرکت پر مُسکرا رہے تھے۔ سارنگ بابا نے بڑی ملائمت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے۔ "تُم اطمینان رکھو، وجے! ہم تمھارے باپ کے مہمان ہیں، اور تُم اپنے باپ کے سب سے بڑے بیٹے ہو۔ اِس لحاظ سے تمھاری ہر فرمائش کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔ تُم اگرچہ اُوشا بیٹی کی گردنِ اُڑا دینے کی بات کر رہے تھے، مگر ہم تمھارے لیے ایک ہاتھی کو سونے کا ضرور بنا دیں گے۔"

سارنگ بابا کی یہ بات سُن کر راجا سُدھانند اور اُس کے درباریوں پر سخت حیرانی

چھا گئی۔ کسی کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وجے کی طرف سے بد تمیزی کے
مظاہرے کے بعد سارنگ بابا یوں اُس کی فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کر لیں گے !

وجے نند سارنگ بابا کے اِن الفاظ سے اتنا خوش ہوا کہ اُس نے بچّوں کی طرح
اُچھلنا کودنا شروع کر دیا۔

کھیت اور بیج

رانا سُدھانند کے آٹھ بیٹے تھے اور وجے نند اُن سب میں بڑا تھا لیکن اُس کی یہ بڑائی صرف یہیں تک تھی۔ طبیعت کے لحاظ سے وہ وہ اپنے سب سے چھوٹے بھائی سے بھی چھوٹا تھا۔ نوجوان وقت گزرنے کے ساتھ بچپن کی عادات کو ترک کر دیتے ہیں مگر وجے نند کا بچپن اُس سے اِس طرح چپک گیا تھا کہ جُدا ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

لیکن بچپنے کی یہ لہر اُس کی طبیعت میں اِس طرح آتی تھی جیسے کسی پاگل کو پاگل

پنے کا دورہ پڑتا ہے۔ عام حالات میں وہ ایک بالکل مختلف وجے نند ہوتا تھا۔ اُس وقت وہ ایک ایسا راج کُمار ہوتا تھا جو گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بغیر کُچھ کھائے پیئے، بغیر کہیں رُکے کئی کئی دِن سفر کر سکتا تھا، جو رات کی تاریکی میں ذرا سی آہٹ پا کر شکاری جانوروں کو اپنے تیر کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اور جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا تھا۔ جو ہاتھی اور شیر درندوں کے سامنے بھی اپنے اوسان بحال رکھتا تھا اور اُنہیں آن کی آن میں قابُو میں کر لیتا تھا۔

مگر اِن ساری مہارتوں کے باوجود اُس نے کسی جنگ میں حصّہ نہیں لیا تھا۔ یہ نہیں کہ اُسے لڑائی سے نفرت تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ لوگوں کے بدن پر ہتھیار سجے دیکھ کر اُس کا سارا جوش غائب ہو جاتا اور بچپنے کی لہر اُسے اپنی گرفت میں لے لیتی تھی۔ پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا تھا۔

اِسی لیے راجا سُدھانند نے اُسے کسی بڑے یا چھوٹے دُشمن کے مُقابلے پر نہیں بھیجا تھا۔ اُس نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا اور یوں اُس کا زیادہ وقت سیر

اور شکار میں گزرتا تھا۔

مگر جب سارنگ بابا نے سونے کے ہاتھی کی بات کی تھی، وہ سیر اور شکار کو بھُول کر سارنگ بابا کے گلے کا ہار ہو گیا تھا۔ سارا دِن نوکروں کی طرح سارنگ بابا کے آگے پیچھے پھرتا اور رات بھر اُن کی پائنتی کھڑا رہتا۔ اس کی صرف اور صرف ایک ہی خواہش تھی کہ سارنگ بابا جلد سے جلد اُسے ایک سونے کا ہاتھی بنا دیں۔

سارنگ بابا وجے نند کی زبردستی کی چاکری سے اُکتانے کے بجائے اُسے اپنی خدمت کا پورا پورا موقع دے رہے تھے اور یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ راج کُمار وجے نند کی خدمت سے بہت خوش ہیں۔ وہ جب سونے کے ہاتھی کی بات کرتا تو سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے اُسے ایک تھپکی دیتے اور کہتے۔

”حوصلہ رکھو، راج کُمار وجے! تمہاری خواہش بہت جلد پوری ہو جائے گی۔“

سارنگ بابا اُسے راج کُمار وجے نند یا راج کُمار وجے کہہ کر ہی بُلاتے تھے۔ خالی وجے نند یا وجے اُن کی زبان سے ایک بار بھی نہیں نکلا تھا۔ میرے لیے یہ

صورتِ حال بڑی عجیب تھی۔ ہمیں راجا سُدھانند کے مہمان خانے میں آئے کتنے ہی دِن ہو گئے تھے۔ ہم جس شکاتولہ کی خاطر یہاں آئے تھے، اُس سے اب تک کوئی بات نہیں ہو سکی تھی۔ اِس کے بجائے راج کُمار وجے نند ہمارے سر پر مسلّط ہو گیا تھا، جسے سوائے سونے کے ہاتھی کے اور کوئی بات سوجھتی ہی نہیں تھی۔ میں اور اُوشا اُس کی اِس رٹ سے بیزار ہو گئے تھے، اور ایک دِن ہماری یہی بیزاری ایک ایسی صورت میں سامنے آئی جس کی خود ہمیں بھی توقّع نہیں تھی۔

رات کا وقت تھا۔ سارنگ بابا پاؤں پسارے لیٹے تھے۔ میں اور اُوشا اُن کے دائیں بائیں بیٹھے تھے اور راج کُمار وجے نند اُن کے پاؤں داب رہا تھا۔ پاؤں دابتے دابتے اُس نے کوئی دس ہزارویں بار اپنی اِس خواہش کا اظہار کیا:

"مہاراج! مُجھے سونے کا ہاتھی کب ملے گا؟"

اور اس سے پہلے کہ سارنگ بابا وجے نند کو تسلّی دیتے، اُوشا بول پڑی۔ "تُجھے شرم نہیں آتی؟ تو مگدھ کا ولی عہد ہے، اور بچّوں کی طرح سارنگ بابا سے سونے کا

ہاتھی مانگے جارہاہے۔ تُونے کبھی سوچاہے کہ ایک دِن تُجھے مگدھ کی راج گدّی پر بیٹھناہے؟"

اُوشاکے یہ الفاظ سُن کر وجے نند پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا اور پھر اٹک اٹک کر بولا۔ "یہ۔۔ تُو۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔ کہہ رہی ہے۔ شیش ناگ کی بیٹی؟ میں۔۔۔۔۔ مُجھے۔۔۔ مُجھے۔۔۔۔ مگدھ کی راج گدّی۔۔۔۔۔۔ پر بیٹھناہے۔۔۔؟"

اُوشا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ وہ بولی۔ "کیا میں غَلَط کہہ رہی ہوں؟ کیا تو راجا سُدھانند کا بڑا بیٹا نہیں ہے؟ کیا تُو اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا نہیں ہے؟" "بڑا ہوں۔ سب سے بڑا ہوں۔" وجے نند بڑبڑایا او پھر سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ خاصی دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا اور اُوشا کے بجائے بابا سے بولا۔ "سارنگ مہاراج! کیا مُجھے ایک دِن مگدھ راج گدّی پر بیٹھنا ہو گا؟ کیا شیش ناگ کی بیٹی ٹھیک کہتی ہے؟"

سارنگ بابا اُٹھ بیٹھے اور کہنے لگے۔ ''شیش ناگ کی بیٹی ٹھیک کہتی ہے یا نہیں، یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ تُو مگدھ کی راج گدّی پر بیٹھے گا یا نہیں، یہ تیری قسمت کی بات ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھ راج کُمار وہ راج گدّی کالی دیوی کا استھان ہے۔ اُس تک پہنچے کے لیے خُون دینا پڑتا ہے۔ کبھی اپنا خون اور کبھی دوسروں کا۔ تُو کالی دیوی کو خوش کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ بات تُجھے سارنگ بابا کے بجائے اپنے دِل سے پوچھنی چاہیے۔ اس لیے کہ تُو راجا سُدھانند کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا ہے۔''

سارنگ بابا کی یہ باتیں سُن کر وجے نند سر جھکا کر گہری سوچ میں کھو گیا۔ پھر اُس نے کوئی بات نہیں کی۔

اگلی صُبح جب ہم سو کر اُٹھے تو راج کُمار وجے نند غائب تھا۔ وہ وجے نند جو سارا سارا دِن نوکروں چاکروں کی طرح سارنگ بابا کے آگے پیچھے پھِرتا اور رات بھر ایک ٹانگ پر اُن کی پائنتی کھڑا رہتا، اچانک نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

ہم نے سارنگ بابا سے پوچھا تو وہ مُسکرا کر خاموش ہو رہے۔ ہم نے بھی اصرار نہیں کیا اور یہ سوچ کر خوش ہو گئے کہ اس ضدّی سے پیچھا چھوٹا جس نے رات دِن بچّوں کی طرح سونے کے ہاتھی کی رٹ لگا رکھی تھی۔

کئی دِن بعد ہمیں معلوم ہوا کہ راج کُمار وجے نند نینی تال کے جنگلوں میں پہنچ کر پھر پہلے کی طرح سیر و شکار میں کھو گیا ہے۔ ہمارے پاس یہ خبر شکاتولہ لے کر آیا تھا اور اِس لیے لے کر آیا تھا کہ کہیں ہم راج کُمار وجے نند کے اِس طرح اچانک چلے جانے سے اُس کے بارے میں فکر نہ کر رہے ہوں۔ وجے نند نے اپنے بارے میں یہ خبر شکاتولہ تک پہنچائی تھی اور وجے نند کے کہنے کے مطابق شکاتولہ نے اِس خبر کو ہم تک پہنچا دیا تھا۔ شاید راج کُمار وجے نند کو راجا سُدھانند اور اُس کے درباریوں میں سے کسی پر بھروسہ تھا تو وہ صرف شکاتولہ کی ذات ہی تھی۔

راج کُمار وجے نند کے بارے میں یہ خبر دینے کے بعد شکاتولہ نے کُچھ دیر خاموشی اختیار کی، پھر سارنگ بابا سے کہنے لگا۔ ”مہاراج! کھیت ایک مدّت سے ویران اور

بنجر پڑا تھا۔ پچھلے دِنوں قدرت کی مہربانی سے بارش ہوئی، زمیں تیّار کر دی گئی۔ اب آپ کی مہربانی سے اُس میں بیج بھی ڈال دیا گیا ہے۔ اُمّید ہے جلد ہی پیچ اُگ آئے گا۔"

سارنگ بابا بولے۔ "کسان کو چاہیے کہ پودوں کی حفاظت کرے، زمین کو پانی دیتا رہے۔ جب فصل تیّار ہو جائے گی تو فصل کا مالک بھی آ جائے گا اور ہری بھری فصل کو دیکھ کر یقیناً کسان سے خوش ہو گا۔"

"ایسا ہی ہو گا، مہاراج۔" شکاتولہ نے آداب بجالاتے ہوئے کہا۔ "کسان ایسا ہی کرے گا۔"

شکاتولہ تو چلا گیا مگر مُجھے عجیب شش و پنج میں ڈال گیا۔ اُس کے اور سارنگ بابا کے درمیان کھیت، کسان اور بیج اور فصل کی جو گفتگو ہوئی تھی، اُسے میں بالکل نہیں سمجھ سکا تھا۔ میں نے اُوشا کی طرف دیکھا تو وہ بھی حیران سی تھی۔ سارنگ بابا اور شکاتولہ کی بات چیت ہمارے پلّے بالکل نہیں پڑی تھی۔

میں نے کُچھ دیر تو اپنا سر کھپانے کی کوشش کی لیکن پھر سارنگ بابا سے پوچھ ہی بیٹھا۔ "بابا جی، یہ شکاتولہ کس کھیت اور بیج کی بات کر رہا تھا؟" "اپنے کھیت اور بیج کی۔" سارنگ بابا نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اپنے کھیت اور بیج کی؟" میں اور بھی حیران ہو گیا۔ "تو کیا وہ کھیتی باڑی بھی کرتا ہے؟"

"شاید کرتا ہو۔"

"لیکن بابا۔" میں نے کہا۔ "وہ تو راجا کا وزیر ہے۔ اُسے دربار کے کاموں سے اتنا وقت ہی کہاں ملتا ہو گا کہ کھیتی باڑی کرے!"

"یہ تو وہی جانے، انوشا بیٹے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ دُنیا میں سو طرح کے کھیت ہیں، اور ہزار طرح کے بیج۔ انسان کی زندگی اُس کا کھیت ہے اور اُس کے کام اُس کھیت کا بیج۔ جو نیکی کا بیج بوتا ہے، اُسے نیکی کی فصل ملتی ہے۔ جو بُرائی کا بیج ہوتا ہے، وہ بُرائی کی فصل کاٹتا ہے۔"

”میں اب بھی کُچھ نہیں سمجھا بابا۔“ میں نے کہا۔

”ابھی تُم کُچھ نہیں سمجھو گے۔“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”ہر بات فوراً انسان کی سمجھ میں نہیں آجاتی۔ کُچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُنہیں سمجھنے میں وقت لگتا ہے۔“

یہ کہہ کر سارنگ بابا خاموش ہو گئے اور میں بھی کُچھ نہ سمجھنے کے باوجود خاموش ہو رہا۔

جمنا کے کنارے

پچاس ہزار سپاہی راجا سُدھانند کے منجھلے بیٹے ویرانند کی ماتحتی میں پاٹلی پُتر سے روانہ ہو چکے تھے۔ جاسوس برابر خبریں لا رہے تھے کہ سانڈل متی پر اپنا جھنڈا لہرانے کے بعد چندر گُپت بڑی تیزی سے آگے بڑھا چلا آ رہا ہے۔ ویرانند منزلوں پر منزلیں مارتا آخر دریائے جمنا کے کنارے جا پہنچا۔ جمنا کے دوسرے کنارے پر چندر گُپت کی فوج ڈیرے ڈالے، ویرانند اور اُس کے سپاہیوں کا انتظار کر رہی تھی۔

دریا کے کنارے پہنچ کر ویر انند نے سپاہیوں کو خیمے لگانے کا حکم دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ چند دِن آرام کرنے کے بعد وہ ساری صورتِ حال کا اطمینان سے جائزہ لے گا۔ پھر یا تو خود دریا پار کر کے چندر گُپت کا مُقابلہ کرے گا یا پھر چندر گُپت کو پیغام بھیجے گا کہ وہ دریا پار کر کے مُقابلے پر آ جائے۔

ویر انند کے سپاہی ابھی سفر کی تکان دُور ہی کر رہے تھے کہ اُن کے خیموں کے درمیان ایک جوگی نمودار ہوا۔ گیروا لباس پہنے، گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالا، اِکتارا بجاتے ہوئے وہ بڑی پیاری لَے میں بھجن اور گیت گا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور نوجوان تھا جو اُس جوگی کا چیلا معلوم ہوتا تھا۔ چیلے کے دونوں ہاتھوں میں کھڑ تالیں تھیں اور وہ اِکتارے کی سنگت کرتے ہوئے یہ کھڑ تالیں بجا رہا تھا۔

ویر انند کے سپاہیوں کو جوگی کے گیت بڑے ہی اچھّے لگے۔ پاٹلی پُتر سے لے کر جمنا کے کناروں تک اُنہوں نے سفر کی تکلیفوں کے سوا اور کُچھ نہ دیکھا تھا۔ ایسے

میں نہیں یوں لگا جیسے جوگی کے پیارے پیارے گیت اُن کے کانوں میں امرت رس ٹپکا رہے ہیں۔ وہ اُس کے گرد جمع ہو گئے اور بڑی دِل چسپی سے اُس کے گیت سُننے لگے۔

اِس کے بعد وہ جوگی اور اُس کے چیلے کو ویرانند کے پاس لے گئے تا کہ وہ بھی اُس کے گیتوں سے لُطف اُٹھا سکے۔ ویرانند نے بھی اپنے سپاہیوں کی طرح پاٹلی پُتر سے جمنا تک سفر کی تکلیفوں کے سوا اور کُچھ نہ دیکھا تھا۔ اُس نے بھی جوگی کے گیتوں کو پسند کیا اور پھر سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُس کے خیمے کے بالکل ساتھ ہی ایک خیمہ جوگی اور اُس کے چیلے کے لیے لگا دیا جائے تا کہ اُس کے گیتوں سے زیادہ سے زیادہ لُطف اُٹھا سکے۔

جوگی نے دو ہی دِن میں ویرانند کو اپنے گیتوں اور اپنی باتوں کا ایسا گرویدہ بنالیا کہ ویرانند اُسے ذرا سی دیر کے لیے بھی اپنے سے جُدا نہ ہونے دیتا تھا۔ جوگی بھی ویرانند کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب تک وہ اُس کے

سامنے سینکڑوں بھجن اور گیت گا چُکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے پاس گیتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔

ویرانند نے جمنا کے کنارے پہنچتے ہی اپنے جاسوس آس پاس کے علاقوں اور دریا کے پار بھیج دیے تھے تاکہ دُشمن کی فوج کے متعلّق معلومات حاصل ہو سکیں۔ دوسرے تیسے روز جاسُوسوں نے یہ خبر دی کہ دریائے جمنا کے پار چندر گُپت کی فوج کی تعداد پندرہ ہزار سپاہیوں سے زیادہ نہیں۔ اُنہیں یہ معلوم ہوا ہے کہ ویرانند پچاس ہزار سپاہیوں کو لے کر جمنا کے دوسرے کنارے آ پہنچا ہے۔ تب سے وہ لڑائی سے بچنے کا بہانہ تلاش کر رہے ہیں اور اُن کے خیموں میں جنگ کی تیّاری کے کوئی آثار نہیں آتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی قافلہ جمنا کے کنارے آ ٹھہرا ہے۔

ویرانند کو یقین ہو گیا کہ چندر گُپت کی فوج پر اُس کی دہشت چھا گئی ہے۔ اُس نے فوراً جوگی کو طلب کیا اور اُس سے ایسے گیت سُنانے کو کہا جو اُس کی خوشی کو دوبالا

کر دیں۔

جوگی نے ویرانند کے حکم کی تعمیل کی، ایسے گیت سُنائے کہ وہ عش عش کر اُٹھا اور اُس کے افسر اور سپاہی بھی جھوم جھوم گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے ویرانند اور اس کے پچاس ہزار سپاہی چندر گُپت سے لڑنے کے لیے نہیں بلکہ اِس جوگی کے گیت سُننے کے لیے ہی پاٹلی پُتر سے جمنا تک آئے تھے۔

جوگی نے صُبح سے گیت گانے شروع کیے تو تیسرے پہر تک برابر گاتا چلا گیا۔ پھر اُس نے ذرا رُک کر جیب سے ایک چھوٹی سی شِیشی نکالی۔ اُس شِیشی میں کوئی دوا تھی۔ دوا جوگی نے اپنے حلق میں انڈیل لی۔ ویرانند نے حیران ہو کر جوگی کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ جوگی اور اُس کا چیلا خاموش ہو گئے اور جوگی دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ ”کیا ہم سے کوئی خطا ہو گئی ہے؟“

ویرانند نے کہا۔ ”نہیں۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ ابھی تُم نے کیا پیا ہے؟ کیا یہ سوم رَس ہے؟“

جوگی نے جواب دیا۔ "نہیں، مہاراج۔ سوم رَس دیوتاؤں کے پینے کی چیز ہے۔ وہ ہمارے نصیب میں کہاں۔ یہ تو ایک دوا ہے جو میرے گُرو کی بخشیش ہے۔ اِس کے چند قطرے حلق میں ڈالنے سے ایک نیا جوش پیدا ہوتا ہے اور گیت گاتے ہوئے ایک نیا لُطف محسوس ہوتا ہے۔ گُرو کہا کرتے تھے کہ یہ دوا مُردہ سے مُردہ آدمی کے دِل میں جینے کا ولولہ اور زندگی کی تڑپ پیدا کر دیتی ہے۔"

جوگی کے اِن الفاظ نے ویرانند کے دِل میں شوق کی آگ بھڑکا دی۔ وہ کہنے لگا "تم اپنی یہ دوا ہمیں پلاؤ گے؟"

"مجُھے ایسا کر کے بڑی خوشی ہوتی مہاراج۔" جوگی نے کہا۔ "لیکن میری شیشی خالی ہو چکی ہے اور دوا میرے پاس نہیں ہے۔"

"کیا تُم یہ دوا تیّار نہیں کر سکتے؟" ویرانند نے پوچھا۔ "یا تمہیں اِس کے تیّار کرنے کا طریقہ نہیں آتا؟"

"طریقہ تو مجُھے آتا ہے۔" جوگی نے کہا۔ "پر ذرا دیر لگتی ہے۔ اگر آپ کُچھ انتظار

کر سکیں تو میں آپ کے لیے تیّار کر سکتا ہوں۔ صرف آپ کے لیے ہی نہیں بلکہ آپ کے سارے لشکر کے لیے۔ آپ اور آپ کے سپاہی اِس دوا کے چند قطرے حلق میں ٹپکانے کے بعد اپنے اندر زندگی کی ایک نئی لہر محسوس کریں گے۔"

یہ سُن کر ویر انند نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تُم یہ دوا تیّار کرو۔ ہم ایک دِن، دو دِن، جتنا کہو انتظار کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے مہاراج۔" جوگی نے کہا۔ "ایک بڑی سی دیگ منگوا دیجئے۔ میں تمام جڑی بوٹیاں جمع کر کے اُس ڈال دوں گا۔ رات بھر جڑی بوٹیاں پانی میں بھیگی رہیں گی، اور پھر کل اُنہیں آگ پر پکایا جائے گا۔ اِس کے بعد اُن کا عرق نکالا جائے گا اور کل شام کے وقت آپ وہ عرق پی سکتے ہیں۔"

ویر انند نے اُسی وقت ایک بڑی سی دیگ منگوا دی۔ جوگی نے اپنے تھیلے سے مختلف جڑی بوٹیاں نکالیں اور اُنہیں دیگ میں ڈال کر دیگ کو لبالب پانی سے بھر دیا۔

دِن نکلتے ہی دیگ کو آگ پر چڑھا دیا گیا اور پھر تیسرے پہر تک جڑی بوٹیاں دیگ کے کھولتے ہوئے پانی میں پکتی رہیں۔ اِس کے بعد اِن جڑی بوٹیوں کا عرق کھینچ کر قطرہ قطرہ ایک برتن میں جمع ہونا شروع ہوا۔

ویرانند پاس بیٹھا بڑے شوق سے دیکھتا رہا۔ انتظار کا ایک ایک پل اُس کے لیے پہاڑ سا ہو رہا تھا۔

شام کے وقت عرق تیّار ہو گیا۔ سب سے پہلے چند قطرے ویرانند نے اپنے حلق میں ٹپکائے۔ اُسے اپنے اندر سچ مُچ ایک نئے جوش اور نئے ولولے کا احساس ہوا اور اُس نے چند قطرے اور اپنے حلق میں ٹپکا لیے۔ اِس کے بعد ویرانند کے سالاروں اور افسروں کی باری آئی۔ وہ قطرے کے بجائے ایک ایک گھونٹ پی گئے اور پھر یہ عرق قطرہ قطرہ کر کے ویرانند کے تمام سپاہیوں میں بٹ گیا۔

مگر ویرانند اور اُس کے افسروں اور سپاہیوں دِلوں میں یہ نیا جوش اور ولولہ کُچھ زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہیں اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہونے

لگا، ہوش و حواس جواب دینے لگے اور پھر وہ سب کے سب بے ہوش ہو گئے۔

اس وقت خاصی رات جاچکی تھی۔ جوگی اور اُس کے چیلے کو اِسی گھڑی کا انتظار تھا۔ وہ چُپ چاپ وہاں کھِسک گئے۔ یہ جوگی چندر گُپت خود تھا اور اُس کا چیلہ اُس کا ایک ہوشیار اور چالاک افسر پدم تھا۔ چندر گُپت نے یہ سارا بہروپ چانکیہ کے مشورے سے بھرا تھا اور دوا کے نام پر ویر انند اور اُس کے سپاہیوں کو دھتورا اور ایسی ہی دوسری زہریلی جڑی بوٹیوں کا عرق پلا کر بے ہوش کر آیا تھا۔

چندر گُپت نے جمنا کے کنارے ویر انند کے ساتھ وہی چال چلی تھی جو اُس سے پہلے سکندر دریائے جہلم کے کنارے پورس کے ساتھ چل چُکا تھا۔ سکندر نے اپنی نقل و حرکت سے پورس کو یہ بتایا تھا کہ وہ اُس وقت دریا عُبور کرنے کے بجائے سردیاں شروع ہونے کا انتظار کرے گا تاکہ جب پانی کم ہو جائے تو دریا پار کر کے پورس کے مُقابلے پر آئے۔ اِسی طرح چندر گُپت نے بڑی کام یابی کے ساتھ ویر انند کو یہ تاثر دیا تھا کہ جب سے ویر انند پچاس ہزار سپاہی لے کر جمنا کے

کنارے پہنچا ہے، تب سے اُس کے سپاہی لڑائی کے بجائے لڑائی سے بچنے بہانہ تلاش کر رہے ہیں اور فوج کے بجائے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی قافلہ جمنا کے کنارے آ ٹھہرا ہے۔

یوں چندر گُپت نے ویر انند کو پوری طرح اپنی طرف سے غافل کر دیا تھا اور اُس کے ساتھ ہی اپنے سپاہی کو اِس بات کی تحقیق کرنے کے لیے بھیجا تھا کہ دریا کو کس کس جگہ سے خُفیہ طور پر پار کیا جا سکتا ہے۔ ویسے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ وہ سکندر کی طرح اِس مُلک میں اجنبی نہیں تھا۔ سارا علاقہ دیکھا بھالا تھا۔

جوگی کے روپ میں ویر انند اور اُس کے سپاہیوں کے لیے مُردہ دِلوں میں زندگی کی تڑپ پیدا کرنے والا عرق تیّار کر رہا تھا تو اُس نے اپنی فوق کو بھیج کر حملے کے وقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ اُس کی فوج جمنا پار کر کے ویر انند کی فوج سے کُچھ فاصلے پر ایک گھنے جنگل میں آ ٹھہری تھی اور اس کا انتظار کر رہی تھی۔

جیسے ہی چندر گُپت پدم کو ساتھ لیے واپس اپنے لشکر میں پہنچا اور جوگی کے بہروپ سے چندر گُپت کے اصل روپ میں آیا، اُس کے لشکر نے ویرانند اور اُس کے سپاہیوں کے خیموں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

جب چندر گُپت نے ویرانند کے لشکر پر حملہ کیا تو صُبح کا اُجالا پھیلنے لگا تھا، ویرانند اور اُس کے سپاسی پورے طور پر ہوش میں نہیں آتے تھے، مگر تلواروں کی جھنکار اور حملہ آور دُشمن کے نعروں کا شور خود بخود اُنہیں مُقابلے پر لے آیا۔

ویرانند کے سپاہیوں کی تعداد پچاس ہزار تھی اور چندر گُپت کے سپاہی پندرہ ہزار سے کسی صورت زیادہ نہ تھے۔ مگر چندر گُپت کے بہروپ نے پچاس ہزار کو پندرہ ہزار کے لیے تر نوالہ بنا دیا تھا۔ لڑائی شروع ہوئی تو دوپہر تک انجام کو پہنچ گئی۔ ویرانند اِس لڑائی میں کا آیا۔ اُس کے چالیس ہزار سپاہیوں کو چندر گُپت کی فوج نے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا اور باقی دس ہزار سپاہیوں کو قیدی بنالیا۔

اور یوں مگدھ کی عظیم سلطنت کا وہ علاقہ بھی شیش ناگ کے بیٹے کے قبضے میں آ

گیا جو مار کنڈ اندی اور دریائے جمنا کے درمیان تھا۔ اِس طرح دریائے سندھ سے لے کر دریائے جمنا تک کے علاقے پر چندر گُپت کی حکومت قائم گئی۔

جمنا کے کنارے چندر گُپت اور ویرانند کی لڑائی میں مگدھ کے چالیس ہزار سپاہیوں کے ہلاک ہونے، دس ہزار سپاہیوں کے قید میں چلے جانے اور خود ویرانند کے مارے جانے کی خبر پاٹلی پُتر میں اُس وقت پہنچی جب راجا سُدھانند کے دربار میں اُس کے جنم دِن کا جشن منایا جا رہا تھا۔ راجا کے جنم دِن کا جشن صُبح کے سُورج کی پہلی کِرن کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ سارا دِن لڑکیاں ناچتی رہی۔ اور راجا اور اُس کے درباری اُن کے ناچ میں کھو کر رہ گئے تھے۔ پھر جب دِن کا اُجالا رات کی تاریکی بدل گیا تو دربار میں ہزاروں مومی اور کافوری شمعیں روشن ہو گئیں۔

اور اس وقت جب کہ رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی اور راجا سُدھانند کے دربار میں ناچ رنگ کی دُنیا اپنی پوری رونقوں کے ساتھ آباد تھی، ایک گھُڑ سوار

پاٹلی پُتر طرف ہوا کی طرح اُڑتا چلا آرہا تھا۔ وہ اُس لڑائی کی خبر لایا تھا جو دریائے جمنا کے کنارے چندر گُپت اور ویرانند کے درمیان ہوئی تھی، اور اِس خبر کو جلد سے جلد راجا تک پہنچانا چاہتا تھا، مگر اُس وقت پاٹلی پُتر مضبوط اور اونچی فصیل کے چونسٹھ کے چونسٹھ دروازے بند ہو چُکے تھے اور اتنی رات گئے کسی دروازے کا پہرے دار دروازہ کھولنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیّار نہ تھا۔

لیکن جب گھُڑ سوار نے پہرے داروں کو اپنے پیغام کی اہمیّت کا احساس دِلایا تو اُنہوں نے دروازہ کھولا۔ گھُڑ سوار نے اندر آتے ہی سیدھا راج محل کا رُخ کیا جو شہر کے وسط میں واقع تھا۔

راج محل کے دروازے پر پہنچ کر اُسے پھر وہی مُشکل پیش آئی جس کا سامنا وہ فصیل کے دروازے پر کر چُکا تھا۔ پہرے داروں اور دربانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کا راجا سُدھانند تک پہنچنا کتنا ضروری ہے، لیکن دربان جانتے تھے کہ اندر جنم دِن کا جشن منایا جارہا ہے، وہ اُس کو راجا کے سامنے پیش کر

کے جشن کے رنگ میں بھنگ ڈالنا نہیں چاہیے تھے۔

ہم، سارنگ بابا، اُوشا اور میں، دربار میں اپنی اپنی جگہ حیرانی اور دِل چسپی سے اُن لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے جو ناچ ناچ کر ہلکان ہوئی جا رہی تھیں، راجا سُدھانند اور اُس کے درباریوں کی طرف دیکھ کر نہ جانے کیوں مُجھے بار بار اُن بھیڑوں کا خیال آ رہا تھا جو بارش اور طوفان سے بچنے کی خاطر ایک غار میں آ جمع ہوتے ہیں۔ اور پھر اِس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب کوئی بھیڑیا اُونگھے اور وہ اُس پر حملہ کر کے اُس کی تِکّا بوٹی کر ڈالیں۔

"مہاراج، مہاراج!" یکایک خوف میں ڈوبی ہوئی ایک آواز نے سب کو اپنی طرف متوجّہ کر لیا۔ یہ وہ شخص تھا جو دریائے جمنا کے کنارے ہونے والی جنگ کی خبر لے کر آیا تھا اور کسی نہ کسی طرح محل کا دروازہ کھلوا کر اندر آنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اُس نے راجا سُدھانند کے سامنے آ کر تین بار آداب کیا اور پھر خوف سے کانپتی

ہوئی آواز میں کہنے لگا:

"مہاراج! غضب ہو گیا۔ جمنا کے کنارے ہماری اور چندر گُپت کی لڑائی ہوئی۔ اِس میں ہمارے چالیس ہزار آدمی مارے گئے اور دس ہزار دُشمن کی قید میں چلے گئے۔ ویر انند مہاراج بھی اس لڑائی میں کام آ گئے ہیں۔"

سُدھانند کے ماتھے پر بَل پڑ گئے۔ وہ غصّے سے کہنے لگا۔ "کون ہے یہ جو اِس خوشی کے موقع پر ایسی منحوس خبر لے کر آیا ہے؟ شکاتولہ! دُور کرو اِسے ہماری نظروں کے سامنے سے۔"

لیکن اِس سے پہلے پہلے کہ شکاتولہ راجا سُدھانند کے حُکم کی تعمیل کرتا، ایک اور شخص تیزی سے اُٹھ کر راجا کے سامنے آ گیا۔ یہ راجا کا بڑا بیٹا وجے نند تھا جو اُس کے نزدیک سب سے بڑا بے وقوف بھی تھا۔

"کیا بات ہے، وجے؟" راجا نے پوچھا۔

مگر وجے نند نے زبان سے کُچھ کہنے کے بجائے میان سے تلوار کھینچ لی۔ ایک بجلی سی کوندی اور دوسرے ہی لمحے وجے نند کی تلوار کے ایک ہی وار سے سُدھانند کا سر تن سے الگ ہو کر دور جا پڑا۔ یہ سب کُچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ درباری مارے حیرت کے اپنی جگہ گڑے رہ گئے۔ کسی کے مُنہ سے آواز تک نہ نکلی۔

وجے نند خُون میں ڈوبی ہوئی تلوار لہراتا ہوا درباریوں کی طرف مُڑا اور اُن سے کہنے لگا:

"او بُزدِلو! بے غیرتو! تمہیں شرم نہیں آتی۔ ہمارے پچاس ہزار سپاہیوں میں سے چالیس ہزار مارے گئے ہیں۔ دس ہزار دُشمن کی قید میں چلے گئے ہیں۔ ہمارا بھائی ویرانند لڑائی میں کام آ گیا ہے اور تمہیں اِس کا ذرا سا بھی رنج نہیں۔ تُم کُچھ کرنے کے بجائے ناچ رنگ میں کھوئے ہوئے ہو! کیا یہ ڈوب مرنے کا مقام نہیں کہ ایک شخص اِس لڑائی کی خبر لے کر آیا ہے اور پِتا جی کہتے ہیں کہ کون ہے یہ جو اِس خوشی کے موقع پر ایسی منحوس خبر لے کر آیا ہے۔ ایسے شخص کو راج گدّی پر

بیٹھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اِس لیے میں نے اِس کا کام تمام کر دیا ہے۔ آج سے یہ راج گدّی میری ہے۔ سُنتے ہو؟ آج سے مگدھ کے راجا ہم ہیں!"

وجے نند کا یہ اعلان سُن کر سب سے پہلے شکاتولہ نے نعرہ بُلند کیا۔ "وجے نند مہاراج کی جے!" اور پھر تمام درباری بھی وجے نند مہاراج کی جَے کے نعرے لگاتے ہوئے اُس کے سامنے جھُک جھُک کر اپنی وفاداری کا اظہار کرنے لگے۔

یہ منظر میرے لیے بڑا ہی تکلیف دہ تھا۔ دربار میں راجا سُدھانند کی لاش پڑی تھی اور درباری تھے کہ اُس کی لاش پر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ کر اپنے باپ کے قاتل وجے نند کے سامنے وفاداری کا اظہار کر رہے تھے۔ وفاداری اور اطاعت کے اِس اظہار میں درباریوں کے علاوہ وجے نند کے اپنے بھائی بھی شامل تھے۔

میری نظروں میں وہ منظر گھوم گیا جب میرے سوتیلے بھائی نے راجا امبھی کا سر کاٹ کر چندر گُپت کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کیا تھا، میرے باپ نے کتنی صحیح بات کہی تھی۔ یہ وہ دُنیا ہے جہاں بھائی بھائی کا بیری ہوتا ہے، یہاں اپنی

گردن بچانے کے لیے بھائی کا گلا کاٹنا پڑتا ہے، اور یہاں بیٹا باپ کو قتل کر کے اُس کی گدّی سنبھالتا ہے۔ اپنے جس بیٹے کو راجا سُدھانند سب سے بڑا بے وقوف سمجھتا تھا، وہی اُسے بھرے دربار میں قتل کر کے اُس کی راج گدّی پر بیٹھ گیا تھا۔

لیکن وجے نند کو اِس کام کے لیے آمادہ کرنے سہرا اشکاتولہ کے سر تھا۔ شکاتولہ نے ہمارے آنے پہلے کئی مرتبہ وجے نند کو اِس راستے پر ڈالنے کوشش کی تھی، مگر اِس معاملے میں وجے نند ایک ایسے کھیت کی طرح تھا جو مُدّت سے ویران اور بنجر پڑا تھا۔ پھر جب وجے نند سونے کے ہاتھی کی خاطر سارنگ بابا کی خدمت میں رہنے لگا تو جیسے قُدرت کی طرف سے اُس بنجر اور ویران کھیت پر بارش ہو گئی۔ اُوشا کی ذرا سی بات نے اُس کھیت کے لیے بیج کا کام کیا اور وجے نند کے دِل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ چاہے تو مگدھ کا راج حاصل کر سکتا ہے۔

ویران اور بنجر کھیت پر بارش ہو چکی تھی۔ اُس میں بیج ڈالا جا چُکا تھا۔ اِس کے بعد شکاتولہ برابر اپنی باتوں سے اِس کھیت کو پانی دیتا رہا۔ اِس کوشش کا نتیجہ اب

ہمارے سامنے تھا۔ مگدھ کی راج گدّی راجا سُدھانند کے بجائے اُس کے بڑے بیٹے وجے نند کے قبضے میں آگئی تھی۔

شکاتولہ اور سارنگ بابا کے درمیان کھیت، کسان، بیج اور فصل کی جو گُفتگُو اُس روز ہوئی تھی اور جِسے میں بالکل نہیں سمجھ سکا تھا، اب اُس کے معنی میری سمجھ میں آ گئے تھے۔

وجے نند سے یوگا نند تک

وجے نند نے بھرے دربار میں اپنے باپ کی گردن اُڑا کر مگدھ کی راج گدّی پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر یہ بات یہیں ختم ہونے والی نہیں تھی۔ غار کے بھیڑیوں میں سے صرف ایک بھیڑیا کم ہوا تھا اور اب بھیڑیے پہلے کی طرح پھر برابر اِس تاک میں تھے کہ کب کوئی اور بھیڑیا اُونگھے اور وہ اُس پر حملہ کر کے اُس کی تِکّا بوٹی کر ڈالیں۔

دوسرے درباریوں کی طرح وجے نند کے چھوٹے بھائیوں نے بھی اُس کے

سامنے اپنی وفاداری کا اظہار کر دیا تھا، لیکن اُنہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وفاداری کے اظہار کے باوجود انہیں ایک پل کے لیے بھی اپنے بارے میں اطمینان نہیں ہو سکتا۔ وہ جانتے تھے کہ راجاؤں کی دُنیا وہ دُنیا ہے جہاں بیٹا باپ کے خُون کا پیاسا اور بھائی بھائی کا بیری ہوتا ہے۔ جس وجے نند نے بھرے دربار میں اپنے باپ کا سر تن سے جُدا کر دیا تھا، اُس کی تلوار کسی بھی وقت اپنے بھائیوں کی گردنوں تک پہنچ سکتی تھی۔

انہیں اچھّی طرح یاد تھا کہ اُن کے باپ راجا سُدھانند نے راج گدّی پر بیٹھتے ہیں اُن تمام مردوں کو چُن چُن کر قتل کروا دیا تھا جو شیش ناگ خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ اُس نے ایسا صرف اس لیے کیا تھا کل کلاں کو اُن میں سے کوئی شخص مگدھ کی راج گدّی کا دعوی نہ کر بیٹھے۔ اُس نے کم سن بچّوں کو بھی نہیں بخشا تھا۔ اِس کے باوجود چندر گُپت اپنی دائی کی مہربانی سے بچ نکلا تھا۔ اُس دائی نے جس کا نام سُندری اور عرف مورا تھا، چندر گُپت کو بچانے کے لیے اپنے بچّے کی قربانی دے دی تھی۔

اور اب وجے نند کے چھوٹے بھائی یہ سمجھ رہے تھے دیر سویر اُن کا بڑا بھائی راجاؤں کے پُرانے طریقے پر چلتے ہوئے اُنہیں اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔ وجے نند ایک تھا اور اُس کے چھوٹے بھائی چھ۔ وہ کُچھ کے چھ وجے نند کے راجا بن جانے کے بعد دِن رات اپنی جان کے خوف سے ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ اور اُن کا ہلکان ہونا کُچھ بلا وجہ بھی نہ تھا۔ سُدھا نند کے قتل کے بعد شکاتولہ کے اِنتقام کے جذبے کی بڑی حد تک تسکین ہو گئی تھی۔ مگر وجے نند کے ذریعے اُس نے جو کھیل شروع کیا تھا، وہ اُسے اُس کے قدرتی انجام تک پہنچائے بغیر اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وجے نند راجا بن جانے کے باوجود پوری طرح اُس کی مُٹھّی میں تھا، اور وجے نند کے چھوٹے بھائی بھی اُس کی مُٹھّی میں تھے۔ ایک بھائی دائیں مُٹھّی میں اور دوسرے چھ بھائی بائیں مُٹھّی میں۔ وجے نند اپنا کام کر چُکا تھا مگر شکاتولہ کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اُس نے وجے نند کے بنجر اور ویران کھیت کو پانی دے دے کر جس فصل کو پروان چڑھایا تھا، اُس کی طرف برابر توجّہ دے رہا تھا۔

شکاتولہ کی اِس کوشش کا نتیجہ چند دِن بعد ہی سامنے آ گیا۔ وِجے نند نے تو اپنے باپ کو بھرے دربار میں قتل کر کے ڈنکے کی چوٹ راج گدّی سنبھالی تھی، مگر اُس کے چھوٹے بھائی شر دھانند نے موقع پا کر سوتے ہی میں وِجے نند کا کام تمام کر دیا اور خود حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ شکاتولہ اور دوسرے درباریوں نے جیسے سُدھانند کے قتل کے بعد وِجے نند مہاراج کی جے کا نعرہ لگاتے ہوئے اُس کی اطاعت قبول کر لی تھی، اِسی طرح اُنہوں نے وِجے نند کے قتل کے بعد شر دھانند مہاراج کی جے کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنی اطاعت اور وفاداری کا اظہار کر دیا۔

اور پھر ایک بھائی کے ہاتھوں دوسرے بھائی کے قتل کا یہ خوف ناک ٹانک کبھی چند دِنوں، کبھی چند ہفتوں اور کبھی چند مہینوں کے وقفے سے پاٹلی پُتر کے راج محل میں دہرایا جانے لگا۔ شر دھانند کو اُس کے چھوٹے بھائی رامانند نے قتل کیا۔ رامانند اپنے بھائی چندانند کے ہاتھوں مارا گیا۔ چندانند کو اُس کے چھوٹے بھائی آتما نند نے موت کے گھاٹ اتارا۔ پھر آتما نند کا کام اُس کے بھائی پدمانند کے ہاتھوں

تمام ہوا۔ اِس پدمانند کو بھی اس کے بھائی یوِگانند نے ایسی صفائی اور ہوشیاری سے ٹھکانے لگایا کہ کسی کو اِس بات کا شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یوِگانند نے راج گدّی کی خاطر اپنے بڑے بھائی کو ہلاک کیا ہے۔

یوِگانند کہنے کو سب بھائیوں میں چھوٹا تھا، مگر وہ اِن سب سے زیادہ چالاک اور مکّار تھا۔ اُس نے اِس بات کا پورا پورا بندوبست کیا تھا کہ پدمانند کی موت قُدرتی مدّت معلوم ہو۔ پر اُس نے پدمانند کی آخری رسمیں بھی بڑی شان سے ادا کی اور اپنی رعایا کو یہی بتانے کی کوشش کی کہ اسے اپنا بھائی جان سے بھی پیارا تھا۔ اور اُس کی موت پر اُس کا دِل خُون کے آنسو رو رہا ہے۔ یہ حقیقت صرف شکاتولہ کے عِلم میں تھی۔ یوِگانند اپنے بھائیوں کے نقشِ قدم پر چل کر مگدھ کی راج گدی تک پہنچا ہے۔

اب مگدھ کی سلطنت یوِگانند کے قبضے میں تھی۔ ایک ایک کر کے اُس کے تمام بھائی ٹھکانے لگ گئے اور اب کوئی شخص ایسا موجود نہ تھا جو مگدھ کی راج گدّی کا

دعویٰ کر سکتا۔ لے دے کے ایک چندر گُپت تھا جو جمنا کے کنارے ویر انند اور اُس کی فوج کو تہس نہس کرنے کے بعد اب اپنی فوج کے ساتھ آندھی کی طرح پاٹلی پُتر کی طرف بڑھا آرہا تھا۔

شکاتولہ ظاہر میں تو یوگانند کی اطاعت کا دم بھر رہا تھا مگر اُس کی اصل وفاداریاں شیش ناگ کے بیٹے چندر گُپت کے ساتھ تھیں، جو برابر پاٹلی پُتر کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ جمنا کے کنارے ویر انند کی شکست اور قتل کے بعد مگدھ کی کوئی فوج اُس کے مُقابلے پر نہیں آئی تھی۔ مگدھ سے کوئی فوج بھیجی جاتی تو چندر گُپت کے مُقابلے پر آتی اور فوج بھیجنے کا ہوش کسے تھا؟ پاٹلی پُتر کے راج محل میں تو غار نے بھیڑیوں والا حال تھا، جو اِس بات کی تاک میں تھے کہ کب کوئی بھیڑیا اُونگھنے لگے، اور وہ اُس پر حملہ کر کے اُس کی تکّا بوٹی کر ڈالیں۔ ایک ایک کر کے سب بھیڑیے ٹھکانے لگ چکے تھے، صرف ایک اور آخری بھیڑیا، یوگانند رہ گیا تھا، جو لومڑی کی طرح مکّار اور چیتے کی طرح چالاک تھا۔ شکاتولہ کے لیے اُسے شیشے میں اُتارنا کُچھ آسان نہ تھا۔

مگر شکاتولہ پھر شکاتولہ تھا۔ چانکیہ اور چندر گُپت کے ساتھ اُس کا خُفیہ سِلسِلہ برابر قائم تھا اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ لومڑی کی طرح مکّار اور چیتے کی طرح چالاک ہونے کے باوجود دیو گانند اپنے باپ سُدھانند کی طرح ناچ رنگ کا رسیا ہے چنانچہ جیسے ہی یو گانند اپنے بھائی کی آخری رسمیں ادا کر کے فارغ ہوا، شکاتولہ نے اُس کے راج گدّی سنبھالنے کی خوشی میں ایک جشن منانے کا بندوبست شروع کر دیا۔

اِس جشن میں اُن لڑکیوں کو بھی اپنے ناچ کے جوہر دِکھانے تھے جنہیں راجا سُدھانند کے درباریوں نے اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مُلک کے کونے کونے سے اکٹھا کیا تھا۔ اِس جشن میں شیش ناگ کی بیٹی اُوشا کو بھی اپنا جادُو جگانا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اِس جشن میں ہمیں، انوشا اور سارنگ مہاراج کو بھی اپنے کمالات دِکھانے تھے۔

یہ جشن راج محل کے دربار عام میں ہونا تھا۔ جس کی چھت بہت سے ستونوں پر

قائم تھی اور یہ تمام ستون پتھّر کے تھے جنہیں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے چبوتروں کے سہارے بنایا گیا تھا۔ پاٹلی پُتر شہر کے علاوہ مگدھ کی سلطنت کے کونے کونے سے معزّز آدمیوں کو اِس جشن میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ شکاتولہ نہایت زور و شور سے جشن کی تیّاریوں میں لگا ہوا تھا، اور یُوں لگتا تھا جیسے وہ اُس کو یوگانند کی زندگی کا ایک یادگار جشن بنانا چاہتا ہے، یہ جشن ایک دِن نہ دو، پورے ایک ہفتے کے لیے تھا۔

آخر مقرّرہ دِن پر مذہبی رسموں کے بعد جشن کا آغاز ہوا۔ پہلے دو دِن اُن پچاس لڑکیوں نے اپنے ناچ کے جوہر دِکھائے، جو ناچ رنگ کے ہر موقع پر دربار میں بلائی جاتی تھیں اور اگلے دو دِن اُن لڑکیوں نے لیے جنہیں درباری نے مُلک کے کونے کونے سے اکٹھّا کیا تھا۔ اُس کے بعد ہماری باری تھی۔ پاٹلی پُتر کے لیے یہ جشن واقعی ایک یادگار جشن تھا۔ مگر ہمارے لیے اُس کی کوئی خاص اہمیّت نہ تھی۔ ہم اس سے پہلے کتنے ہی جشنوں اور کھیل تماشوں میں شامل ہو چکے تھے۔ سارنگ بابا کے دوست بستی کے سردار کا وہ جشن جو اس نے اپنی بیوی کے

تندرست ہونے کی خوشی میں منایا تھا اور جہاں سے ہمیں شانی جیسا سانپ ہاتھ آیا تھا، راجا پورس کے دربار کا جشن، جس کے نتیجے میں اُوشا ہمارے ساتھ شامل ہوئی تھی اور پھر ٹیکسلا کا وہ جشن جو میرے باپ راجا امبھی نے سکندر کو خوش کرنے کی خاطر منایا تھا اور جس میں مُجھے ایک سپیرے اور اُس کے چار ساتھیوں کا مُقابلہ کرنا پڑا تھا۔

ہم نے وہ جشن بھی دیکھا تھا جو راجا سوبھُوتی نے سکندر کے اعزاز میں منایا تھا اور جس میں اُس نے سکندر کو اپنے کُتّوں کی فوج کا ہاتھیوں اور گھوڑوں سے مُقابلہ دِکھایا تھا۔ اس جشن میں سکندر کے پانچ گھڑ سوار راجا سوبھُوتی کے کُتّوں کے مُقابلے پر آئے تھے۔ گھڑ سواروں اور کُتّوں کے درمیان یہ جنگ یوں ختم ہوئی کہ پانچوں گھڑ سوار زمین پر زخمی پڑے تھے اور گھوڑے اپنے سواروں کو پھینک کر بھاگ گئے تھے۔ پھر ہم نے دریائے بیاس کے کنارے سکندر کی واپسی کا جشن دیکھا تھا، جس میں سکندر کے سپاہیوں نے تو بڑے جوش و خروش سے حصّہ لیا تھا مگر سکندر کو اِس جشن کو دِلچسپ بنانے سے کُچھ ایسی دِلچسپی نہ تھی۔ اُس نے نہ

سپیروں اور جوگیوں کو اپنے کمالات دِکھانے کا حکم دیا اور نہ اُوشا کا ناچ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

پھر ہم نے وہ جشن بھی دیکھا تھا جو میرے باپ نے چندر گُپت کے اعزاز میں منایا تھا، اور جس میں اُس نے یہ کوشش کی تھی کہ یہ جشن سکندر والے جشن سے زیادہ شان دار ہو۔ اور پھر راجا امبھی کی طرف سے چندر گُپت کو وہ تحفہ پیش کیا گیا تھا جو سکندر کو دیے ہوئے تحفے سے بڑھ کر تھا۔ یہ تحفہ خود امبھی کا سر تھا جو امبھی کے بیٹے، میرے سوتیلے بھائی نے پیش کیا تھا۔

یوگانند کے جشن کی رونق کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں اِن تمام جشنوں کے منظر گھوم رہے تھے، اور جب پانچویں دِن ہماری باری آئی تو میرے دِل اور دماغ میں ایک عجیب سی کشمکش ہو رہی تھی۔ ہمیں چانکیہ نے شکاتولہ کی مالی اِمداد کے لیے بھیجا تھا اور اِس غرض کے لیے بھیجا تھا کہ جِس راج گدّی پر اُس وقت یوگانند بیٹھا تھا اُس پر شیش ناگ کا بیٹا چندر گُپت بیٹھ سکے۔ شکاتولہ جو کُچھ کر رہا تھا، اِسی

غرض سے کر رہا تھا اور یہ جشن جو اُس نے بظاہر یوگانند کو خوش کرنے کے لیے کیا تھا، اُس کی انہی کوششوں کے سِلسِلے کی کڑی تھا جو وہ چندر گُپت کے لیے کر رہا تھا۔

بُوڑھا سپیرا

اُوشا رقص کرنے کے لیے اُٹھی تو میں بھی بین سنبھال کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُوشا دربار کے ایک ستُون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور میں اِس سے دو قدم کے فاصلے کھڑا ہو کر بین بجانے لگا۔ یہ ایک عام سی دُھن تھی۔ اُوشا ستُون سے ٹیک لگائے اپنے ایک پیر کو حرکت دیتی رہی اور پھر اُس نے میری طرف ویسی ہی نظروں سے دیکھا جیسے کہ راجا پورس کے دربار میں دیکھا تھا۔ اُس وقت اُس کی نظریں کہہ رہی تھیں ”کوئی ایسی دُھن بجاؤ جو اُوشا کے لائق ہو۔ یہ کیا پیں پیں کر رہے ہو!“

اور اس وقت اُس کی نظریں کہہ رہی تھیں:

”سیدھی طرح مہاتالی کیوں نہیں بجاتے؟“

اور میں نے اُوشا کی نظروں کا پیغام سمجھتے ہوئے مہاتالی کی دُھن چھیڑ دی اور پھر جو اُوشا نے ناچنا شروع کِیا تو کیا بڑے کیا چھوٹے سب پر جادُو کر دیا۔ جیسے جیسے میری بین کی دُھن تیز ہوتی گئی، اُوشا کے ناچ میں تیزی آتی گئی۔

یکایک ایک بھاری بھرکم آواز گونجی ”ٹھہرو!“

اِس آواز کے ساتھ ہی میری بین اور اُوشا کے قدم خود بخود رُک گئے۔ ہم نے چونک کر دیکھا۔ ایک بُوڑھا نہ جانے کِس طرف سے نکل کر ہمارے بالکل قریب آ کھڑا ہوا تھا! بُوڑھے نے یوگانند کو تین بار جھُک کر سلام کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ یوگانند نے کِسی قدر غصّے سے کہا۔ ”اے بُوڑھے! کون ہو تُم اور کیا چاہتے ہو؟“

بُوڑھے نے ایک بار پھر یوگانند کو جھک کر سلام کیا اور کہنے لگا۔ "مہاراج! میں کون ہوں اور کیا چاہتا ہوں، یہ آپ کو انوشا مہاراج بتائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ مُجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیوں، انوشا مہاراج! کیا آپ مُجھے پہچانتے ہیں؟"

میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر پہچان کر جواب دیا۔ "ہاں۔ کیا تم وہی سپیرے نہیں ہو جِس نے ہم پر اُس وقت اپنے بیٹے کے قتل کا الزام لگایا تھا۔ جب ہم نے ٹیکسلا میں شیش ناگ کے سُرخ ہیروں کا تُحفہ سکندر کو پیش کیا تھا، اور پھر سکندر کے حکم سے تُم نے اپنے چار ساتھیوں سمیت میرا مُقابلہ کیا تھا اور اِس مُقابلے میں بُری طرح شکست کھائی تھی؟"

"ہاں۔" بُوڑھے نے جواب دیا۔ "تُم نے ٹھیک پہچانا۔ میں وہی ہوں اور اپنے بیٹے کے قاتلوں کا پیچھا کرتے ہوئے ٹیکسلا سے پاٹلی پُتر آ پہنچا ہوں، تاکہ جو انصاف مُجھے سکندر اور راجا امبھی کے دربار میں نہیں مل سکا، اُسے یوگانند مہاراج کے دربار میں حاصل کر سکوں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر یوگانند کی طرف مُڑا اور اُسے سلام کر کے کہنے لگا۔ ”مہاراج! یہ لوگ میرے بیٹے کے قاتل ہیں۔“

یوگانند نے کہا۔ ”ہم پورا معاملہ جاننا چاہتے ہیں۔ تمہارا بیٹا کہاں قتل ہوا اور کیسے قتل ہوا؟ ساری بات بتاؤ ہم تمہارے ساتھ انصاف کریں گے۔“

اس سے پہلے کہ بُوڑھا کُچھ کہتا میں نے کہا۔ ”اے راجا! میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس شخص کا بیٹا کون تھا اور کہاں تھا۔ صرف اتنا جانتے ہیں کہ جب میں اور سارنگ بابا کشمیر میں تکشک مہاراج کے مندر سے ویری ناگ کی طرف چلے تھے تو راستے میں ہمارا قیام ایک ایسی بستی میں ہوا تھا جس کا سردار سارنگ بابا کا دوست تھا۔ اُس کی بیوی ایک مدّت سے بیمار تھی۔ سارنگ بابا نے اُسے دیکھا تو اُس کا اصل مرض جان گئے۔ ایک سانپ نہ جانے کیسے اُس کے جسم میں داخل ہو گیا تھا اور جونک کی طرح اُس کے جسم میں داخل ہو گیا تھا اور جونک کی طرح اس کے کلیجے سے چمٹا ہوا اُس کا خون چُوس رہا تھا۔ بابا

جی نے وہ سانپ اُس کے جسم سے نکالا تو وہ ٹھیک ہو گئی۔ اُس کے ٹھیک ہو جانے کی خوشی میں سردار نے تین دِن تک دس دس کوس تک کی تمام بستیوں کے لوگوں کی دعوت کی اور اِس کے ساتھ ہی ایک جشن بھی منایا۔

اس جشن میں مختلف کھیل تماشے دِکھانے والی ٹولیاں دُور دُور سے بُلوائی گئی تھیں۔ جب وہ لوگ اپنا اپنا کمال دِکھا چُکے تو سردار نے تمام لوگوں کے سامنے ایک بار بتایا کہ یہ جشن میری بیوی کی بیماری دور ہونے خوشی میں منایا جارہا ہے اور اُس بیماری کو دُور کرنے سہرا سارنگ بابا اور انوشا کے سر ہے۔

یہ بتانے کے بعد سردار نے سارنگ بابا سے کوئی تماشا۔ دکھانے کے لیے کہا۔ سارنگ بابا اور میں سردار کے تخت کے سامنے کھُلی جگہ میں آئے ہی تھے کہ لوگوں کے شخص چھلانگ لگا کر ہمارے سامنے سانپ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جو ہم نے سردار کی بیوی کے جسم سے نکالا تھا۔ سارنگ بابا نے اُسے بتایا کہ تُم بہت دیر سے آئے ہو۔ اِس بات کو تو پندرہ دِن ہو چکے ہیں۔ وہ سانپ اب یہاں نہیں

ہے۔ نہ ہمارے پاس اور نہ اِس بستی میں۔ سارنگ بابا تو اُس سانپ کو ایک دوا بنانے کے لیے استعمال کر چکے تھے، جب اُس شخص نے یہ دیکھا کہ وہ سانپ ہمارے پاس نہیں ہے تو وہ سردار سے کہنے لگا کہ مُجھے تو یہ لوگ دھوکے باز معلوم ہوتے ہیں جنھوں نے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے جوگیوں اور سنیاسیوں کا روپ دھار رکھا ہے۔ میں نے سینکڑوں قسم کے سانپ دیکھے ہیں، لیکن یہ بات آج تک کہیں دیکھی نہ سُنی کہ کوئی سانپ کسی آدمی کے جسم میں داخل ہو گیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سانپ پہلے سے اِن لوگوں کے پاس موجود تھا اور اُنھوں نے مداری کی طرح نظر بندی اور ہاتھ کی صفائی دِکھاتے ہوئے اسے آپ کی بیوی کے جسم سے نکال کر دِکھا دیا آپ کی اجازت سے میں ان مداریوں سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔

سارنگ بابا نے اُسے سمجھایا کہ تُم شاید کھیل تماشے دِکھانے والے مداریوں کی بنسریاں بند کرنے والے کھلاڑی ہو لیکن ہم مداری نہیں ہیں۔ مگر وہ کسی طرح ماننا ہی نہ تھا۔ سارنگ بابا کے ساتھ مُقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ کسی طرح بھی مانتا

نظر نہ آیا تو سارنگ بابا بھی اُس کے ساتھ مُقابلہ کرنے پر راضی ہو گئے۔

اُس نے اپنی پٹاری سے ایک سانپ نکالا اور کہنے لگا کہ یہ وہ سانپ ہے جو پتھّر پر ڈنک مارے تو پھر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس نے سارنگ بابا کو اپنا ہاتھ آگے کرنے کو کہا۔ سارنگ بابا نے اپنا بایا ہاتھ آگے کیا تو سانپ نے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ لیکن سارنگ بابا اطمینان سے کھڑے رہے جیسے کُچھ ہوا ہی ہیں۔

اُس کے بعد سارنگ بابا کی باری تھی۔ اُنہوں نے وہی سانپ اُس سے لیا اور مُجھے بین پر ایک خاص دُھن بجانے کا حکم دیا۔ سانپ بین کی دُھن پر مست ہو گیا اور پھر اُس نے ایسے زور سے پھُنکار ماری کہ اُس شخص کا سارا جسم سر سے پاؤں تک خُشک لکڑی کی طرح جلنے لگا اور اُس نے بھاگ کر قریبی جوہڑ میں چھلانگ لگا دی۔

اس شخص کے جوہڑ میں چھلانگ لگاتے ہی سارا جوہڑ ایک دہکتے ہوئے الاؤ کی شکل اختیار کر گیا۔ تھوڑی دیر بعد جوہڑ کا پانی بھاپ بن کر اُڑ گیا اور جوہڑ کی جگہ پتھّر کی سِل کی طرح سخت ہو گئی۔ اب وہاں اُس شخص کی نہ لاش تھی، نہ ہڈّیاں

اور نہ ہڈّیوں کی راکھ۔

اے راجا! اُس جوہڑ کی جگہ کو مٹّی سے بھرواکر آگے ویری ناگ کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ ہم ویری ناگ سے بھی بہت آگے کیسر ناگ سے ہو کر واپس اُس جوہڑ کی جگہ کے پاس آئے تو اُس کے اندر سے ہمیں سفید اور سُرخ ہیرے ملے۔ سفید ہیرے ہم نے پرور پور میں تکشک مہاراج کی بھینٹ چڑھا دیے تھے اور سُرخ ہیرے پشکلاوتی کے شیش ناگ کے لیے رکھ لیے تھے۔ پھر ہم نے شیش ناگ کی ہدایت پر اُن سُرخ ہیروں کو سکندر بادشاہ کے دامن میں ڈال دیا تھا۔

اے راجا! ہمیں نہیں معلوم کہ وہ شخص اس بُوڑھے کا بیٹا تھا یا نہیں، لیکن وہ سانپ اب تک ہمارے پاس ہے۔ یہ ایک طرح سے میرا بھائی ہے اور ہم اُسے شانی کہہ کر پُکارتے ہیں۔ اور اے راجا! جب سکندر بادشاہ کے سامنے اِس بوڑھے نے یہی بات کہی تھی تو سارنگ بابا نے اُس سے یہاں تک کہا تھا کہ تمہارے بیٹے کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ ایک اتّفاقی بات تھی اور اِس میں خود تمہارے بیٹے کی ضِد

کو دخل تھا۔ کہو تو ہم شانی کو تمہارے حوالے کر دیں اور کہو تو پاؤں پڑ کر تم سے معافی مانگ لیں۔ لیکن یہ تو وہاں اِنتقام اِنتقام پُکار رہا تھا۔ سکندر کے حکم پر میں نے اِس کا اور اِس کے چار ساتھیوں کا مُقابلہ کیا اور آج اگر یہ یہاں زندہ کھڑا ہے تو صرف اِس لیے کہ سارنگ بابا نے اِس کی اور اِس کے ساتھیوں کی جان بخش دی تھی، حالانکہ اِس نے اور اِس کے ساتھیوں نے مُجھے ختم کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

اتنا کہہ کر میں نے اطمینان کا ایک سانس لیا اور تو پھر اِس بُوڑھے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”کیوں؟ میں نے جو کُچھ کہا، ٹھیک ہی کہا نا؟“

”ہاں!“ بُوڑھے نے جواب دیا۔ ”آپ نے جو کُچھ کہا ٹھیک ہی کہا۔ اور میں بھی جو کُچھ کہوں گا، ٹھیک ہی کہوں گا۔ میں نے ٹیکسلا سے یہاں تک کا سفر صرف اسی لیے کیا ہے کہ جو انصاف مُجھے سکندر بادشاہ کے دربار سے نہیں مل سکا، اُسے یو گا نند مہاراج کے دربار سے حاصل کر سکوں۔“

اتنا کہہ کر اُس نے یوگا نند کو جھک کر سلام کیا اور کہنے لگا۔ ”مہاراج! آپ نے خود انوشا کی زبان سے سب کچھ سُن لیا ہے۔ اب اِس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ انوشا اور سارنگ بابا میرے بیٹے کے قاتل ہیں اور قاتل کو پھانسی کی سزا ملنی چاہیے۔ لیکن مہاراج! میں اگر اِن لوگوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہو تو اِس لیے نہیں کہ یہ میرے بیٹے کے قاتل ہیں بلکہ اِس لیے کہ یہ لوگ یہاں چندر گُپت کے جاسُوس بن کر آئے ہیں۔“

بُوڑھے کے یہ الفاظ دھماکے سے کم نہیں تھے۔ میں نے گھبرا کر اُوشا اور سارنگ بابا کی طرف دیکھا۔ اُوشا تو بڑے آرام سے ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور سارنگ بابا نہایت اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھے تھے۔ حالانکہ یہ وہ بات تھی جسے سُنتے ہی تمام اہلِ دربار سنّاٹے میں آ گئے تھے۔

”کیا کہا؟“ یوگا نند کا مُنہ حیرت سے کھُل گیا۔ بُوڑھا کہنے لگا۔ ”میں نے یہ عرض کیا ہے مہاراج، کہ انوشا، اُوشا اور سارنگ بابا اِس دربار میں چندر گُپت کے لیے

جاسوسی کر رہے ہیں۔"

اِس پر شکاتولہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر بُوڑھے کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "بابا! تُم نے بڑی مہربانی کی جو مہاراج کی خیر خواہی کی خاطر ٹیکسلا سے چل کر یہاں تک آئے اور ہمیں چندر گُپت کے جاسُوسوں کی خبر دی، مگر کُچھ کارروائی کرنے سے پہلے ہم اِس بات کا اطمینان کر لینا چاہتے ہیں کہ تمہاری بات کس حد تک درست ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ انوشا، اُوشا اور سارنگ بابا چندر گُپت کے جاسُوس ہیں۔"

"ثبوت؟" بُوڑھے نے کہا۔ "آپ خُود اِن سے پُوچھ لیجیے۔ مجُھے یقین ہے کہ جیسے اُنہوں نے میرے بیٹے کے بارے میں ٹھیک کہا ہے، اِسی طرح اِس بارے میں بھی ٹھیک ہی کہیں گے۔"

"بُوڑھے! تمہاری عقل ٹھکانے ہے؟" شکاتولہ نے غصّے سے کہا۔ "تم اُوشا، انوشا اور سارنگ بابا پر جاسُوس ہونے کا الزام لگا رہے ہو، اور ساتھ ہی کہتے ہو کہ خُود

اُن سے پُوچھ لو۔ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ کوئی جاسُوس اپنے مُنہ سے جاسوس ہونے کا اقرار نہیں کیا کرتا؟"

"آپ ایک بار اِن سے پُوچھ کر تو دیکھیے، مہاراج۔" بُوڑھے نے کہا۔

"پُوچھ لیتے ہیں۔ ابھی پُوچھ لیتے ہیں۔" یوگانند نے جلدی سے کہا۔

اور پھر یوگانند اُوشا سے مخاطب ہوا۔ "شیش ناگ کی بیٹی! یہ بُوڑھا کہتا ہے کہ تُم لوگ چندر گُپت کے جاسُوس ہو۔ تُو اِس بارے میں کیا کہتی ہے؟"

اُوشا تڑپ کر ستون سے الگ ہو گئی اور بولی۔ "مگدھ کے راجا کو معلوم ہونا چاہیے کہ چندر گُپت شیش ناگ کی بیٹی کا بھائی ہے۔ مُنہ بولا بھائی۔ اور بہن جہاں کہیں بھی ہو، اپنے بھائی کا بھلا چاہتی ہے۔ وہ ایک جان تو کیا، سو جانیں بھی اپنے بھائی پر سے وار سکتی ہے؟"

"اور انوشا مہاراج کیا کہتے ہیں؟" یوگانند نے طنز سے کہا۔

اور اِس سے پہلے کہ میں زبان کھولتا، سارنگ بابا جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھے اور میرے پاس آ کر بولے۔ ”اے راجا! تیری بات کا جواب میں دیتا ہوں۔ سُن اور ذرا غور سے سُن۔ یہ راج گدّی جس پر تُو اِس وقت بیٹا ہے، کبھی اِس پر تیرا باپ بیٹھتا تھا، تیرے بھائی بیٹھتے تھے۔ آج تُو اِس گدّی پر بیٹھا ہے، کل یہ کسی اور کے قبضے میں ہو گی۔ تُو خُون کے دریا سے گُزر کر اس گدّی تک پہنچا ہے، اور جو بھی آئے گا، وہ خُون کے دریا سے گُزر کر آئے گا، اِس لیے کہ راج گدّی کالی دیوی کا استھان ہے۔ اِس تک پہنچنے کے لیے خُوں دینا پڑتا ہے۔ کبھی اپنا خُون اور کبھی دوسروں کا خُون۔ تیرے باپ نے شیش ناگ خاندان کے سب مردوں کو چُن چُن کر قتل کروا دیا تھا تا کہ اُن میں سے کوئی تخت کا دعوے دار نہ بن جائے، مگر اِس کے باوجود قُدرت نے اپنی مہربانی سے چندر گُپت کو چندر گُپت کو بچا لیا، اور دیکھ لینا وہی قُدرت ایک دِن اِس چندر گُپت کو مگدھ کی راج گدّی پر لا بِٹھائے گی۔“

”خاموش!“ یوگا نند غصّے سے دہاڑا۔ ”ورنہ ہم تمہاری زبان گدّی سے کھنچوا دیں

گے۔“

سارنگ بابا نے اُس کے غصّے سے کوئی اثر لیے بغیر کہا ”اے راجا! تُو سارنگ کو خاموش ہونے کا حکم دیتا ہے۔ سارنگ چاہے تو تیری زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دے۔ تُجھے یہاں سے اُٹھا کر سمندر میں پھینک دے تُجھے تیرے اِس محل اور خزانوں سمیت بھسم کر ڈالے۔ لیکن سارنگ ایسا نہیں کرے گا، کیوں کہ اُس نے بھلائی کا سبق پڑھا ہے، بُرائی کا نہیں۔ تیرے ساتھ جو کُچھ ہونا ہے، وہ تیری کوششوں کے باوجود ہو کر رہے گا۔ سارنگ اپنے ہاتھ گندے کیوں کرے؟

اے راجا! تُجھے کُچھ خبر نہیں کہ تیرے سامنے کون کھڑا ہے۔ یہ وہ انوشا ہے کہ آگ، پانی، ہوا اور مٹّی چاروں اِس کا حکم مانتے ہیں۔ اِس پر شیش ناگ اور تکشک ناگ دونوں کا سایہ ہے۔ بڑے بڑے راجاؤں نے اِس کے آگے سر جھُکایا ہے۔ بڑے بڑے بلوانوں نے اِس کے سامنے ماتھا رگڑا ہے، کان پکڑے ہیں۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ اِسی بُوڑھے سے پوچھ لے۔ اکیلے انوشا نے اِس کا اور

اِس کے چاروں ساتھیوں کا کیسے مُقابلہ کیا تھا، اور کیسے اِن کی جانیں بچی تھیں؟“

یُوں لگتا تھا جیسے سارنگ بابا کی اِن باتوں نے یوگانند کے دِل پر خوف طاری کر دیا ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غصّہ اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا، مگر وہ کُچھ کہنے کے کے بجائے صرف مُنہ کھولنے اور آنکھیں پھاڑے اُن کی طرف تکے جا رہا تھا۔

سارنگ بابا پھر کہنے لگے۔ ”اے راجا! سُن اور غور سے سُن! تیرے باپ کا وقت پُورا ہوا تھا تو تیرا اسے سے بڑا بھائی وجے نند اُس گدّی پر بیٹھا تھا۔ تُم چھ بھائی ایک دوسرے کے خُون سے کالی دیوی کو خوش کر کے باری باری راج گدّی پر بیٹھے۔ اب تیرا وقت بھی ہو چُکا ہے اور تیری جگہ لینے والا بھی یہاں آ چکا ہے۔۔۔ دیکھ! اپنے پیچھے دیکھ۔۔۔!“

یوگانند نے گھبرا کے پیچھے کی طرف دیکھا۔ اسی وقت شکاتولہ کی تلوار فضا میں بجلی کی طرح لہرائی۔ دوسرے ہی لمحے یوگانند کی گردن تن سے جُدا ہو کر دور جا

پڑی۔

اِس کے ساتھ ہی ہمارے پاس کھڑے ہوئے بُوڑھے نے اپنی نقلی داڑھی اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے اتار پھینکے۔۔۔ اب وہ چندر گُپت تھا۔۔۔ شیش ناگ کا بیٹا چندر گُپت۔۔۔ وہ سیدھا راج گدّی کی طرف بڑھا اور اُس کے ساتھ ہی شکاتولہ نے زور سے نعرہ لگایا۔ "چندر گُپت مہاراج کی جے!" دوسرے ہی لمحے حیران پریشان درباری چندر گُپت کی جے کے نعرہ لگاتے ہوئے اُس کے سامنے جھک جھک کر وفاداری کا اظہار کر رہے تھے۔

ذرا سی دیر میں مگدھ کی عظیم سلطنت یوگانند کے ہاتھوں سے نکل کر شیش ناگ خاندان کے سپوت چندر گُپت کے قبضے میں آگئی تھی۔

قاتل حلوائی

چندر گپت غیر معمولی طور پر دلیر اور حوصلہ مند تھا۔ یہی دلیری اور حوصلہ مندی اُسے ٹیکسلا میں سکندر کے سامنے لے گئی تھی، اِسی دلیری اور حوصلہ مندی سے اُس نے سانڈل متی کا قلعہ چتر بودھ کے محاصرے سے چھڑُایا تھا۔ اِسی دلیری اور حوصلہ مندی سے اُس نے دریائے جمنا کے کنارے ویر انند کو شکست دی تھی اور اُس کے چالیس سپاہیوں کو اِس طرح گاجر مولی کی مانند کاٹ کر رکھ دیا تھا کہ مگدھ کی طرف سے پھر کوئی اُس کے مُقابلے پر نہیں آیا تھا۔

مگر پاٹلی پُتر میں ہمارے پہنچنے کے بعد سے یو گا نند کے قتل تک جو کُچھ ہوا، اُس کے پیچھے حوصلہ مندی اور دلیری کے ساتھ ساتھ چانکیہ کی غیر دانائی اور چالاکی کام کر رہی تھی۔ چندر گُپت بُوڑھے سپیرے کا بہروپ بھر کے یو گا نند کے دربار میں ضرور جا پہنچا تھا، لیکن یہ ساری چال چانکیہ کی تھی۔ اُسی کے دماغ نے یہ حیرت انگیز ترکیب نکالی تھی۔ شکاتولہ نے جو کیا تھا، وہ چانکیہ کی ہدایت کے مطابق کیا تھا۔ اِسی لیے جب چانکیہ نے شکاتولہ کو اپنی انگوٹھی انعام میں دی تو شکاتولہ نے کہا تھا:

”چانکیہ مہاراج! تُم چالاکی اور دانائی کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ ہو۔ تُم عقل کا وہ سمندر ہو جِس کی کوئی تھاہ نہیں۔ تمہارا دماغ ایک ایسا دریا ہے جس کی تہہ میں عقل اور دانائی کے نہ جانے کیسے کیسے قیمتی اور نایاب موتی موجود ہیں۔“

اس کھیل میں بظاہر ہمارا حصّہ برائے نام تھا۔ کہنے کو چانکیہ نے ہمیں شکاتولہ کی امداد کے لیے ٹیکسلا سے پاٹلی پُتر بھیجا تھا، مگر یہاں ہم نے راجا سُدھانند اور اُس

کے بیٹوں کا دھیان بٹانے کے سِوا کوئی اور کام نہیں کیا تھا اور اگر اِس سے زیادہ کُچھ کیا بھی تھا تو صرف اتنا کہ اُوشا نے راجا سُدھانند کے بڑے بیٹے وِجے نند کے دِل میں یہ خیال ڈال دیا تھا کہ وہ ہمّت سے کام لے کر مگدھ کی راج گدّی پر بیٹھ سکتا ہے۔ یہ صرف کھیت میں بیج ڈالنے والی بات تھی۔ کھیت کو پانی شکاتولہ نے دیا تھا۔ فصل اُس نے تیّار کی تھی۔ سُدھانند کے قتل سے لے کر یوگانند کے قتل تک جو کُچھ ہوا، اُس میں بڑی حد تک شکاتولہ کا ہاتھ تھا۔ مگر وہ ہاتھ تھا جو چانکیہ کے اشاروں پر حرکت کرتا تھا۔ اِس کے باوجود شکاتولہ، چانکیہ اور چندرگُپت یوں ہمارے قدموں میں بِچھے جا رہے تھے جیسے یہ ساری مُہم ہماری کوششوں سے سر ہوئی ہے۔

چندرگُپت نے مگدھ کی راج گدّی پر بیٹھنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے نام کے ساتھ موریہ کا لفظ بڑھا دیا۔ یہ اُس مہربان دائی کی یاد میں تھا جس کا نام سُندری اور عرف مورا تھا اور جس نے چندرگُپت کو سُدھانند کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچانے کی خاطر اپنے بیٹے کی قربانی دی تھی۔ چندرگُپت نے شیش ناگ

کا بیٹا ہونے کے باوجود موریہ کہلانا پسند کیا تھا کیونکہ مورا جیسی عورت کی بے مثال
قربانی کی بدولت ہی شیش ناگ خاندان کے آخری فرد کی زندگی کا چراغ راجا
سُدھانند کے ہاتھوں گُل ہونے بچ گیا تھا۔ اگر مورا نے اپنے جگر کا ٹکڑا چندر گُپت
پر قربان نہ کر دیا ہوتا تو آج مگدھ کی راج گدّی دوبارہ شِیش ناگ خاندان کو ملنے کا
سوال ہی نہیں رہ جاتا تھا۔ چندر گُپت نے اپنی دلیری اور چانکیہ کی دانائی کی
بدولت مگدھ کی راج گدّی پر قبضہ تو کر لیا تھا اور شکاتولہ اور دوسرے درباریوں
نے اُس کی اطاعت بھی قبول کر لی تھی، مگر اُس کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔
اگرچہ نند خاندان کا صفایا ہو چکا تھا مگر پھر بھی کتنے لوگ ایسے تھے جو چندر گُپت
کے بجائے نند خاندان کے ہمدرد تھے۔ آخر اِس خاندان نے مہاپدم نند سے لے
کر یوگا نند تک مگدھ پر ایک نہ دو، پورے ڈیڑھ سو سال حکومت کی تھی اور اُس
کے حمایتی دو چار دِن میں ختم نہیں ہو سکتے تھے۔

شاید اِسی لیے چندر گُپت مسلسل دو راتیں کسی ایک کمرے میں نہیں سوتا تھا۔
دُشمنوں نے اُس کی جان کے لیے طرح طرح کے منصوبے بنائے، مگر چانکیہ کی

عقل مندی اور چالاکی سے یہ تمام منصوبے ناکام ہوتے رہے۔

چانکیہ نے چندر گُپت کی حفاظت کو اپنا خاص فرض سمجھ رکھا تھا۔ ایک بار اُس نے چندر گُپت کے خاص کمرے کے باہر کی دیوار پر چیونٹیوں کی ایک قطار دیکھی۔ یہ چیونٹیاں روٹیوں کے باریک باریک ٹکڑے اُٹھا کر لے جا رہی تھیں۔ چانکیہ فوراً ساری بات سمجھ گیا اور اُس نے اُسی وقت حکم دے دیا کہ کمرے کو آگ لگا دی جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور اِس طرح چندر گُپت کے دُشمن جو موقع کی تلاش میں اُس کمرے کے تہہ خانے میں چھُپے ہوئے تھے، آگ میں جل کر بھسم ہو گئے۔

لیکن ایک دِن ایسا بھی آیا کہ چانکیہ کی تمام چالاکی اور ہوشیاری کے باوجود چندر گُپت ایک ایسی مُصیبت میں پھنس گیا جس کے متعلّق اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک دِن آدھی رات کو عام آدمی کے بھیس ہیں اکیلا پاٹلی پُتر کی سیر کو نکلا تاکہ لوگوں کے خیالات اور اُن کی تکلیفیں جان سکے۔ اُس وقت بازار میں ایک

حلوائی کی دُکان کھُلی ہوئی تھی۔ اُس نے سوچا، تھوڑی سی مٹھائی کھالوں۔ حلوائی اُسے دُکان کے پچھلے حصّے میں لے گیا، جہاں اُس نے اپنے گاہکوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنارکھی تھی۔ چندر گُپت آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیااور حلوائی نے مختلف قسم کی مٹھائیاں تھال میں سجا کر اُس کے سامنے رکھ دیں۔

مٹھائی بے حد لذیذ تھی، چندر گُپت مزے لے لے کر کھا رہا تھا کہ حلوائی نے ایک کل دبائی۔ کھٹاک کی آواز آئی۔ چندر گُپت کے نیچے سے تختہ سِرکا اور وہ دھم سے دُکان کے اندھیرے سے تہہ خانے میں جا ِگرا۔ اُس کے گرنے کے بعد تختہ پھر اپنی جگہ پر آگیا۔

تہہ خانے میں گھُپ اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر تو چندر گُپت آنکھیں پھاڑے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، اور جب اُس کی آنکھیں اندھیرے سے ذرا مانوس ہوئیں تو اُس نے اپنے ارد گرد کی جگہ کو ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ ذرا دیر بعد ہی اُس کے ہاتھ ایک چیز سے ٹکرائے اور جب اُس نے اچھّی طرح اُس چیز کو ٹٹولا تو اُس کے بدن

میں سنسنی دوڑ گئی۔ یہ ایک انسانی کھوپڑی تھی۔

چندر گُپت نے گھبرا کر اُس کھوپڑی کو ایک طرف پھینک دیا اور پھر تہہ خانے کے فرش کو ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا۔ ذرا دیر بعد ایک اور کھوپڑی اُس کے ہاتھوں میں تھی۔ پھر ایک اور۔۔۔۔ پھر ایک اور۔۔۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس اندھیر سے تہہ خانے میں سینکڑوں کھوپڑیاں ہیں۔

تہہ خانے میں انسانی کھوپڑیوں کی موجودگی اِس بات کا صاف پتا دیتی تھی کہ دُکان کا مالک جو بظاہر حلوائی بنا بیٹھا ہے، مٹھائیوں کی آڑ میں کسی خوف ناک کاروبار میں مشغول ہے۔ چندر گُپت جتنا سوچتا تھا، اُتنا ہی پریشان ہوتا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں اب تک قسم قسم کے خطروں کا سامنا کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مگدھ کی راج گدّی پر قبضہ کر لینے کے بعد اُن خطرات کا خاتمہ ہو گیا ہے مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ میں پاٹلی پُتر کے بازار میں ایک حلوائی کی دُکان کے اندر وہ ایک ایسے خطرے سے دوچار ہو گا جس کے سامنے پچھلے خطروں کی کوئی حیثیت نہیں۔

وہ رات چندر گُپت نے انسانی کھوپڑیوں کے درمیان جیسے تیسے گزاری۔ صُبح ہوئی تو تہہ خانے کے پاس قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اُس کے بعد ایک مرد اور ایک عورت کی باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ چندر گُپت نے دروازے سے کان لگا دیے اور کُچھ سُننے کی کوشش کرنے لگا۔

دروازے کے دوسری طرف حلوائی اپنی بیٹی سے باتیں کر رہا تھا، چندر گُپت کو اُن کی باتیں سُن کر یوں محسوس ہوا جیسے خُون اُس کی رگوں میں جمنے لگا ہے۔ اُن باتوں سے اُسے معلوم ہوا کہ حلوائی کم بخت اپنی مٹھائیوں میں انسان مغز ملاتا ہے۔ جب بھی کوئی ہٹّا کٹّا نوجوان اُس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، وہ اُسے تہہ خانے میں پہنچا دیا ہے اور پھر اُسے قتل کر کے اُس کے مغز سے ایک خاص قسم کی مٹھائی تیّار کرتا ہے۔

چندر گُپت کی محل سے غائب ہونے کی بات ایسی نہ تھی کہ پوشیدہ رہ سکتی، مگر چانکیہ اور شکاتولہ نے اُس بات کی پوری پوری کوشش کی کہ یہ بات صرف راج

دربار کے لوگوں میں ہی رہے اور آگے پھیلنے نہ پائے۔ چندرگُپت کو مگدھ کی راج گدّی سنبھالے ابھی دِن بھی کتنے ہوئے تھے۔ اُس کے دُشمن نہ جانے کہاں کہاں چھُپے ہوئے کسی مناسب موقع کی تاک میں تھے۔ چندرگُپت کے راج محل سے غائب ہو جانے کی خبر عام ہونے کی صورت میں یہ بھی مُمکن تھا کہ کوئی دُشمن موقع پاکر راج گدّی پر قبضہ کرلے۔

چندرگُپت کے غائب ہونے سے راج دربار میں ویسی ہی گھبراہٹ اور بھاگ دوڑ پھیل گئی تھی جیسی راجا پورس کے دربار میں اُس وقت پھیلی تھی جب، جشن کے موقع پر عین آدھی رات کے وقت اُوشا غائب ہو گئی تھی۔

مگر وہ اُوشا تھی اور راجا پورس کے سپاہی اُس کی تلاش میں پورے ایک ماہ تک سلطنت کا چپّا چپّا چھان سکتے تھے۔ مگر یہاں معاملہ شیش ناگ کے بیٹے کا تھا جو خود مگدھ کی راج گدّی کا مالک تھا۔ اُس کے یُوں غائب ہونے سے اُس کی زندگی ہی نہیں، وہ راج گدّی بھی خطرے میں پڑ گئی تھی جسے سو جتن کرکے حاصل کیا گیا

تھا۔

چانکیہ کے حکم سے فوج کے وفادار سپاہیوں نے خُفیہ طور پر پاٹلی پُتر کا ایک ایک گھر دیکھ ڈالا تھا۔ تیز رفتار گھڑ سواروں نے سینکڑوں میل تک کا علاقہ چھان مارا تھا۔ پاٹلی پُتر کے گرد کوئی بستی ایسی نہ تھی جہاں سپاہی چندر گُپت کی تلاش میں نہ پہنچے ہوں مگر اِس کے باوجود چندر گُپت کا سُراغ ملنا تھا، نہ ملا۔

اور پھر تیسرے دِن، ٹھیک آدھی رات کے وقت چانکیہ ہمارے پاس آیا۔ سارنگ بابا کو جیسے پہلے سے اِس کا اندازہ تھا اور وہ مُجھے اور اُوشا کو باتوں میں لگائے وقت گزار رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھُلا تھا۔ جیسے ہی چانکیہ نے اندر قدم رکھا، ہم نے اُٹھ کر آداب کیا اور پھر سارنگ بابا کہنے لگے:

"چانکیہ جی! آپ اور یہاں! آپ نے ہمیں کیوں نہ بُلوایا؟"

چانکیہ نے مُسکرانے کی کوشش کی لیکن اُس کا چہرہ اُداسی اور پریشانی کی چُغلی کھا رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "سارنگ بابا، تین دِن ہو گئے ہیں، ابھی تک چندر گُپت مہاراج

کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔"

سارنگ بابا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ تو یونہی گھبرا رہے ہیں، چانکیہ جی شیش ناگ کا بیٹا پھر کوئی بہروپ بھر کر کسی طرف نِکل گیا ہو گا۔ آپ جانیں پُرانی عادت مُشکل سے ہی چھوٹا کرتی ہے۔"

"مذاق چھوڑیے، مہاراج!" چانکیہ نے کہا۔ "یہاں ہماری جان پر بنی ہوئی ہے، دِل دھڑک رہا ہے کہ جانے کِس وقت کیا ہو جائے۔"

"تو پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

چانکیہ نے گِڑگِڑاتے ہوئے کہا۔ "حکم نہیں، درخواست ہے۔ کسی طرح سے چندر گُپت کا پتا چلائیے، اُنہیں ڈھونڈ کر لائیے تاکہ ہماری پریشانی ختم ہو۔"

سارنگ بابا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم تو جوگی ہیں۔ چندر گُپت شیش ناگ کا بیٹا ضرور ہے، لیکن وہ کوئی سچ مُچ کا ناگ نہیں ہے کہ ہم اُسے بِین بجا کر کہیں نے

نکال لائیں۔"

چانکیہ نے اب تک کسی قدر رکھ رکھاؤ سے بات کی تھی، مگر سارنگ بابا کی مُسکراہٹ نے جیسے اُسے احساس دِلا دیا کہ رکھ رکھاؤ سے کام نہیں چلے گا۔ اُس نے سارا رکھ رکھاؤ ایک طرف رکھتے ہوئے سارنگ بابا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور کہا:

"میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ کُچھ کیجیے، ورنہ ہم سب کی محنت پر پانی پھِر جائے گا۔ آپ چندا رانی کے لیے سونے کا ہاتھی بنا سکتے ہیں، راج کُماری چمپا کو ناگ کے پنجے سے نکال کر پورس کے بیٹے کا گھر آباد کر سکتے ہیں۔ آپ نے راجا پورس کے لیے اتنا کُچھ کیا ہے۔ آپ نے سکندر لیے اتنا کُچھ کیا ہے، تو کیا آپ چندر گُپت کے لیے نہیں کر سکتے؟ میں نے اپنے لیے کِسی سے کبھی کُچھ نہیں چاہا! کُچھ نہیں مانگا، میرا سوال صرف چندر گُپت کے لیے ہے، شِیش ناگ کے بیٹے کے لیے جو اُوشا کا مُنہ بولا بھائی بھی ہے۔ کیا اُس کا آپ پر کوئی حق نہیں ہے؟"

سارنگ بابا کہنے لگے۔ ”حق تو ہے، مگر آپ سے زیادہ نہیں۔ ہم نے تو صرف اتنا ہی کیا تھا کہ اِسے سکندر کے عتاب سے بچا کر دریائے جہلم کے پار پہنچا دیا تھا۔ اِس کے بعد آپ نے اُس کے لیے جو کُچھ کیا ہے، وہ ایک باپ بھی بیٹے کے لیے نہیں کرتا۔ شِیش ناگ کے بیٹے کی دلیری اور حوصلہ مندی اپنی جگہ ہے لیکن آپ کی عقل اور دانائی کا جواب نہیں۔ اگر آپ کی عقل اُس کی حمایت میں نہ ہوتی تو اُسے مگدھ کا راج شاید ہی مل سکتا۔“

چانکیہ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور کہا۔ ”مُجھے شرمندہ نہ کیجئے۔ میں جانتا ہوں کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔“

”ایسا نہ کہیے۔“ سارنگ بابا نے چانکیہ کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”آپ تو وہ ہستی ہیں جنہیں دُنیا والے رہتی دُنیا یک یاد رکھیں گے۔ جس طرح لوگ سکندر کے ساتھ پورس کا نام لیں گے، اِسی طرح چندر گُپت کے ساتھ چانکیہ کا نام آئے گا۔ شکاتولہ نے سچ کہا تھا کہ آپ چالاکی اور دانائی کا کبھی ختم نہ ہونے والا خزانہ ہیں اور

عقل کا ایسا سمندر ہیں جس کی کوئی تھاہ نہیں۔ آپ کا دماغ ایک ایسا دریا ہے جس کی تہہ میں عقل اور دانائی کے نہ جانے کیسے کیسے قیمتی اور نایاب موتی موجود ہیں۔ جب تک یہ دُنیا قائم رہے گی، تب تک تمام راجا، تمام بادشاہ، راج پاٹ اور حکومت کے کاموں میں آپ کی عقل سے رہنمائی حاصل کریں گے۔"

یہ کہتے ہوئے سارنگ بابا نے چانکیہ کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔ چانکیہ نے کہا۔ "آپ کیوں مُجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ جس عقل اور جس ذہانت کی اتنی تعریف کر رہے ہیں، وہ تمام کوشش کے باوجود چندر گُپت کا کوئی سُراغ نہیں لگا سکی۔ میں تو یہی انتہا کرنے آیا تھا کہ شِیش ناگ کے بیٹے کے لیے کُچھ کریں، مگر آپ نے تو مُجھے ہی ہواؤں میں اُڑانا شروع کر دیا ہے۔"

سارنگ بابا نے چانکیہ کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور مُجھ سے کہنے لگے۔ "انوشا بیٹے، قدرت نے تمہیں وہ طاقت بخشی ہے کہ بڑے بڑے راجا تمہارے آگے سر جھکائیں اور بڑے بڑے بلوان تمہارے سامنے کان پکڑیں اور ماتھا رگڑیں۔ لیکن

آؤ اور آگے بڑھ کر چانکیہ مہاراج کے ہاتھوں کو بوسہ دو۔ کل کو تُم اپنی خوش قسمتی پر ناز کرو گے کہ تُم نے ایک ایسے شخص کے ہاتھوں کو بوسہ دیا ہے جس کی عقل رہتی دُنیا تک راجاؤں اور بادشاہوں کی رہنمائی کرے گی۔“

سارنگ کا حکم پا کر میں نے چانکیہ کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ پہلے انہیں چُوما اور پھر آنکھوں سے لگایا۔

میں نے چانکیہ کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا ہی تھا کہ مُجھے سارنگ بابا کی آواز سُنائی دی۔ ”انوشا بیٹے! تمہیں یاد ہو گا کہ ایک بار تُم ہمارے دوست سردار کا وہ بچّہ ڈھونڈ کر لائے تھے جو اُس کے دُشمن اُٹھا کر لے گئے تھے۔ پھر تُم اُوشا بیٹی کو ڈھونڈ کر لائے تھے جو مہاراجا پورس کے دربار سے ایک غائب ہو گئی تھی۔ تُم نے شِیش ناگ کے بیٹے کو سکندر کے دربار سے اُٹھا کر جہلم کے پار پہنچا دیا تھا۔ اب ایک بار پھر ذرا تکلیف کرو، اور دیکھو کہ شِیش ناگ کا بیٹا کہاں ہے۔“

سارنگ بابا کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے یُوں محسوس کیا جیسے میں ایک

گھُپ اندھیرے تہہ خانے میں ہوں۔ مگر تہہ خانے کا یہ اندھیرا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اِس لیے کہ میری نگاہیں اُس تہہ خانے کی ایک ایک چیز کو یُوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہاں رات کا اندھیرا نہ ہو، دِن کا اُجالا ہو۔ اُس تہہ خانے کے فرش پر دو چار یا دس بیس نہیں، سینکڑوں انسانی کھوپڑیاں پڑی تھیں اور ایک کونے میں شیش ناگ کا بیٹا چندر گُپت اِس حال میں پڑا تھا کہ اُس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور مُنہ میں کپڑا ٹھُنسا تھا۔

میں ابھی اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ سے حرکت بھی نہ کرنے پایا تھا کہ تہہ خانے کا دروازہ کھُلا اور ایک نوجوان لڑکی ایک ہاتھ میں بڑی سی مومی شمع اور دوسرے ہاتھ میں دُودھ کا گلاس تھامے اندر آئی۔ اُس نے شمع ایک طاق میں رکھی، پھر چندر گُپت کے مُنہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا اور دودھ کا گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چندر گُپت دودھ کے گھونٹ لیتا رہا اور وہ اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

چندر گُپت نے دُودھ کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد نظریں اُوپر اٹھائیں تو سامنے کی دیوار کے قریب مُجھے کھڑا دیکھا اور وہ چیخ اُٹھا:

"انوشا! آپ یہاں؟"

چندر گُپت کی آواز سُنتے ہی لڑکی نے تیزی سے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور چُبھتے ہوئے لہجے میں بولی:

"تُم؟ تُم کون ہو اور یہاں کیسے آ گئے؟"

"یہی سوال میں تُم سے پُوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

لڑکی کے بولنے سے پہلے ہی چندر گُپت نے جواب دیا۔ "اِس کا نام یشودھا ہے، اور یہ اُس حلوائی کی بیٹی جس کی دُکان اس تہہ خانے کے اوپر ہے۔ اُسی حلوائی نے مُجھے یہاں بند کر رکھا ہے۔ وہ اپنی مٹھائیوں میں انسانی مغز ملاتا ہے اور یہاں جو کھوپڑیاں نظر آ رہی ہیں یہ انہی بدقسمت لوگوں کی ہیں۔"

”ہاں۔“ یشودھا نے کہا۔ ”اور اب تک اِس نوجوان کا مغز بھی کِسی مٹھائی میں شامل ہو کر تھال میں سج گیا ہوتا لیکن میں نے ضد کر کے اُسے اپنے باپ سے مانگ لیا ہے۔ اب اگر یہ مُجھ سے شادی کر لے تو اِسے یہاں سے رہائی مل سکتی ہے، ورنہ میں اسے اپنے باپ کے حوالے کر دوں گی۔ اسے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے تین دِن ملے ہیں۔ یہ میعاد صبح ہونے کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔“

اور پھر وہ چندر گُپت سے کہنے لگی۔ ”کیوں؟ کیا فیصلہ کیا تم نے؟“

چندر گُپت نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اِس کے بجائے وہ مُجھ سے مخاطب ہوا۔ ”انوشا جی، مُجھے شروع ہی سے اِس بات کا اطمینان رہا ہے کہ جب بھی وقت آیا، جہاں بھی آیا، آپ میری حفاظت کریں گے۔ مُجھے یقین تھا کہ جس طرح آپ نے ٹیکسلا میں میری جان بچائی تھی، اُسی طرح پاٹلی پُتر میں بھی میری جان بچانے آئیں گے۔“

اور پھر وہ یشودھا سے بولا۔ ”اے حلوائی کی بیٹی! تُجھے خبر بھی ہے کہ تیرے سامنے کون کھڑا ہے؟ یہ وہ انوشا ہیں جِن پر شِیش اور تکشک دونوں کا سایہ ہے، قدرت نے اُنہیں وہ طاقت بخشی ہے کہ بڑے بڑے راجاؤں نے اِن کے آگے سر جھکایا ہے۔ یہ چاہیں تو تُجھے اور تیرے باپ دونوں کو ایک ہی پھونک مار کر بھسم کرڈالیں۔“ ”ہوں گے۔“ یشودھا نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ”میں تو ایک بات جانتی ہوں کہ تُم مُجھ سے شادی کیے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتے۔“

پھر وہ اچانک ایک قدم بڑھا کر میرے سامنے آگئی اور بولی۔ ”میں نے اسے صُبح تک کی مہلت دی ہے۔ اگر یہ نہ مانا تو میں اِسے دوبارہ اپنے باپ کے حوالے کر دوں گی اور پھر اِس تہہ خانے کی کھوپڑیوں میں ایک اور کھوپڑی کا اضافہ ہو جائے گا اور اِس کا مغز مٹھائی کے تھال میں سج جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”یشودھا رانی، تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تُم جس نوجوان سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ وہ کون ہے؟“

”نہیں۔“یشودھا نے جواب دیا۔”میں نہیں جانتی کہ نوجوان کون ہے۔اِس نے میرے بار بار پوچھنے پر بھی نہیں بتایا۔ مگر یہ راجا ہو یا بھکاری، سپاہی ہو یا سپیرا، مجھے اِس سے کُچھ غرض نہیں۔“

میرے لیے چندر گُپت کو اِس تہہ خانے سے نکال لے جانا کوئی بات نہ تھی، لیکن یشودھا کی باتوں نے مُجھے بے حد متاثر کیا تھا۔اُس کی دلیری اور اِرادوں کی بُلندی ایسی تھی کہ میں تو کیا، کوئی شخص بھی اُسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔چندر گُپت نے بھی یشودھا کی اِس دلیری کو محسوس کیا تھا۔ اور وہ دِل ہی دِل میں اُس کی تعریف کر رہا تھا۔میں خاموش کھڑا یشودھا کر دیکھتا رہا۔پھر کہنے لگا:

”آؤ میں تُم دونوں کو ایک ایسی جگہ لے چلتا ہوں جہاں تم دونوں آزادی اور اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ کر سکو گے۔کُچھ عجب نہیں کہ یہ فیصلہ تمہارے حق میں اچھّا ثابت ہو۔“

”میں تیّار ہوں۔“یشودھا نے جواب دیا۔

پھر اُس نے جھک کر چندر گُپت کے ہاتھ پاؤں کھول دیے اور میں اُن دونوں کو لے کر راج محل کی طرف چل دیا۔

راج محل کے دروازے خود بخود کھُلتے گئے اور میں چندر گُپت اور یشودھا کو لیے سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر پہنچتے ہی سارنگ بابا کی آواز میرے کان میں آئی:

"لیجیے چانکیہ جی، شِیش ناگ کا بیٹا آگیا ہے۔ اکیلا نہیں آیا، شاید کوئی سوغات بھی ساتھ لایا ہے۔"

سارنگ بابا کے اِن الفاظ کے ساتھ میں یوں چونکا کہ ایک گہرے خواب سے جاگا ہوں۔ چانکیہ کے دونوں ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھے اور میں اُنہیں اپنی آنکھوں سے لگائے ہوئے تھا۔ چانکیہ ایک دم اپنے ہاتھ چھڑا کر چیخ اُٹھا:

"انوشا جی! آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اِرد گرد دیکھ رہا تھا اور چندر گُپت اور یشودھا حیرانی سے میری طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے اُنہیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہو۔ جیسے وہ کوئی سپنا دیکھ رہے ہوں۔ اور چانکیہ بے قراری کے ساتھ اپنا سوال دُہرا رہا تھا۔

"انوشا جی، آپ کہاں چلے گئے؟ اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ یہ لڑکی کون ہے؟"

پہلے چندر گُپت نے اپنی حیرانی پر قابو پایا اور رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔ "اِس کا نام یشودھا ہے، اور اِس کا باپ شہر کا ایک مشہور حلوائی ہے۔ اِس نے مُجھے دھوکے سے ایک تہہ خانے میں قید کر رکھا تھا۔ وہ ظالم اپنی مٹھائیوں میں انسانی مغز ملاتا ہے۔ اُس کے تہہ خانے میں اُن بد قسمت لوگوں کی سینکڑوں کھوپڑیاں پڑی ہیں جو اُس کے خوف ناک کاروبار کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔"

اب تک یشودھا بھی اپنی حیرانی پر قابو پا چکی تھی۔ جیسے ہی چندر گُپت ذرا رُکا، اُس نے جھَٹ اُس کے مُنہ کی بات چھین لی۔ بولی۔ "رُک کیوں گئے؟ آگے یہ کیوں

نہیں بتاتے کہ آپ بھی اِس کاروبار کی بھینٹ چڑھ گئے ہوتے اور آپ کا مغز بھی کِسی مٹھائی میں شامل ہو کر کسی تھال میں سج گیا ہوتا، اگر اِس یشودھا نے اس کو بچا نہ لیا ہوتا اور اب انوشا جی اِس یشودھا کر اِس لیے ساتھ لائے ہیں کہ۔۔۔"

چانکیہ نے حیرانی اور دِلچسپی سے پہلے یشودھا کی طرف دیکھا اور پھر چندر گُپت کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگا۔ "میں ساری بات سمجھ گیا ہوں بیٹی۔ تُو نے مہاراج کی جان بچائی ہے۔ تُو نے ایسا کر کے ہماری برسوں کی محنت کو برباد ہونے سے بچا لیا ہے۔ تُو اِس کے لیے انعام کی حق دار ہے اور میں چندر گُپت مہاراج کی طرف سے وعدہ کرتا ہوں کہ تُجھے مُنہ مانگا انعام ملے گا۔۔۔۔ بول! کیا مانگتی ہے؟"

یشودھا ذرا دیر خاموش رہی پھر بولی۔ "میں نہ سونا چاہتی ہوں اور نہ ہیرے موتی۔ صرف اتنا چاہتی ہوں کہ مہاراج کے قدموں میں رہ سکوں۔"

"یشودھا بیٹی، تُو مہاراج کی رانی بنے گی لیکن اس وقت نہیں، اُس وقت جب تیرا باپ اپنے گھناؤنے ظُلم کی سزا کو پہنچ جائے گا۔ اُس وقت تک تُو یہاں مہاراج کی

نگرانی میں رہے گی۔ بالکل اُسی طرح جیسے تُو نے مہاراج کو اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔ انصاف کے پلڑے ہر حال میں برابر رہنے چاہیں۔"

اِس کے بعد چانکیہ کی ہدایت پر یشودھا کو راج محل کے ایک کمرے میں بھجوا دیا گیا اور کمرے کے باہر پہرا لگا دیا گیا۔ اُس کے ساتھ ہی چندرگُپت کے پرانے وفادار اور ہوشیار افسر پدم کو سپاہیوں کا ایک دستہ دے کر حلوائی کے مکان پر بھیجا گیا۔ سپاہیوں نے مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا، حلوائی کو گرفتار کر لیا اور وہ تمام انسانی کھوپڑیاں اپنے قبضے میں لے لیں جو حلوائی کے تہہ خانے برآمد ہوئی تھیں۔

کھوپڑیوں کی گواہی

حلوائی کی گرفتاری سے سارے پاٹلی پُتر میں سنسنی پھیل گئی تھی اور لوگ اُن کھوپڑیوں کو دیکھنے آ رہے تھے جو اس کے تہہ خانے سے بر آمد ہوئی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک حلوائی ایسا گھناؤنا اور خوف ناک جُرم بھی کر سکتا ہے۔ تہہ خانے سے بر آمد ہونے والی کھوپڑیاں حلوائی کو پھانسی کے تختے ایک پہنچانے کے لیے کافی تھیں۔ مگر یہ بات لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ اِن کھوپڑیوں کی بدولت اُن کی آنکھیں ایک ایسا انوکھا تماشا دیکھیں گی جو اِس سے پہلے کسی نے دیکھا تو کیا، سُنا بھی نہ ہو گا۔

دربار میں چندر گُپت ہر روز عدالت لگا کر مقدموں فیصلے کرتا تھا۔ اُس نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی شہروں، قصبوں بلکہ دیہات تک میں انصاف کی راہیں کھول دی تھیں۔ لوگوں کو اُس کے سامنے ہر قسم کے مقدمات پیش کرنے کی اجازت تھی۔ دیہات میں اُس نے پنچائتیں قائم کر رکھی تھیں جنہیں مقامی مقدمات کے فیصلے کرنے کے اختیارات دے دیے گئے تھے اور جِن مقدموں کا فیصلہ چھوٹی عدالتوں میں نہیں ہو سکتا تھا اُن کا فیصلہ خود چندر گُپت اپنی عدالت میں کرتا تھا۔ سزائیں بڑی سخت تھیں۔ کسی مجرم کا ہاتھ یا پیر کاٹ دینا ایک عام بات تھی۔ بعض اوقات مجرم کا سر مُنڈوا دیا جاتا تھا اور یہ سزا ایسی تھی کہ لوگوں کے نزدیک اِس سے بڑی ذلّت اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

حلوائی کا مقدمہ چندر گُپت کی عدالت میں پیش ہوا تو ایک عجیب اُلجھن پیدا ہو گئی۔ چندر گُپت اِس مقدمے میں عدالت کے سب سے اُونچے مقام پر بیٹھا تھا۔ اُسے اِس مقدمے میں ایک فریق کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ حلوائی کے خلاف پہلی اور آخری گواہی صرف اُس کی بیٹی یشودھا کی تھی اور جس طرح اولاد کی

گواہی باپ کے حق میں قبول نہیں کی جاسکتی تھی اسی طرح یہ گواہی باپ کے خلاف بھی قبول نہیں کی جاسکتی تھی۔ پورے شہر میں اور کوئی گواہ ایسا نہ تھا جو یہ بیان کر سکتا کہ اُسے حلوائی کے اِس خوف ناک کاروبار کا عِلم رہا ہے۔ جھوٹی گواہی دینا ویسے ہی بہت بڑا جُرم تھا، اور یہاں تو صُورت یہ تھی کہ پاٹلی پُتر والے اِس حلوائی کے اصل کاروبار کی حقیقت سے بالکل ہی لاعلم تھے۔ چندرگُپت اگرچہ مگدھ کی راج گدّی کا مالک ہونے کی حیثیت سے حلوائی کو بڑی سے بڑی سزا دے سکتا تھا مگر عدالت کی کُرسی پر بیٹھ کر وہ پورا انصاف کرنا چاہتا تھا، اور اِس انصاف کے لیے گواہوں کی ضرورت تھی جِن کے بیانوں کی روشنی میں حلوائی کا جُرم ثابت ہو سکے۔

یہ اُلجھن حلوائی کے علم میں تھی، اِس لیے اُس نے نہایت ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تو ایک ایمان دار حلوائی ہوں اور ایک عرصے سے مٹھائی بنا کر شہر کے لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں۔ تہہ خانہ جو میری دُکان کے نیچے ہے، بہت دِنوں سے بند پڑا ہے اور میں نے اِسے کبھی نہیں کھولا۔ تہہ

خانے سے جو کھوپڑیاں نکلی ہیں یہ کس کی ہیں اور یہاں آئیں، اِس کے متعلّق میں کُچھ نہیں جانتا۔"

حلوائی کی اس ڈھٹائی کی بِنا پر گواہوں کی ضرورت اور بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ گواہوں کے بغیر حلوائی کو سزا نہیں دی جا سکتی تھی۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر چندر گُپت اپنے بیان کو حلوائی کے خلاف استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ یشودھا حلوائی کی بیٹی تھی، اِس لیے اُس کا بیان باپ کے خلاف استعمال نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ہو بھی سکتا تو حلوائی کہہ سکتا تھا کہ چانکیہ نے یشودھا کو رانی بنانے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔

یہ ایسی اُلجھن تھی کہ اِس کا حل نہ شکاتولہ کے پاس تھا اور نہ چانکیہ کے پاس۔ چندر گُپت نے یہ ساری اُلجھن سارنگ بابا کے سامنے پیش کی تو وہ کہنے لگے:

"شیش ناگ کے بیٹے! ہو سکتا ہے کہ حلوائی سچ کہتا ہے اور اِسے اِن کھوپڑیوں کے بارے میں کُچھ پتا نہ ہو کہ کِس کی ہیں اور کہاں سے آئی ہیں۔ لیکن اگر تُم چاہو تو

اِن کھوپڑیوں کو زبان مل سکتی ہے۔“

”کیا؟“ چندر گُپت کا مُنہ حیرت سے کھُل گیا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا جی؟“

”تُم چاہو تو یہ کھوپڑیاں بول سکتی ہیں۔ اپنا اپنا ماجرا بیان کر سکتی ہیں۔ پھر تمہیں پتا چل جائے گا کہ یہ کِس کی ہیں اور کہاں سے آئی ہیں۔ تُم اِن کھوپڑیوں کی گواہی پر حلوائی کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتے ہو۔“

چندر گُپت یُوں حیرانی سے سارنگ بابا کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ اُس نے کہا:

”ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ کھوپڑیاں بول سکتی ہیں؟“

سارنگ بابا مُسکرا دیے۔ ”تُم خود دیکھ لو گے شیش ناگ کے بیٹے۔ کل یہ کھوپڑیاں تمہارے سامنے پیش ہو کر اپنا اپنا حال بیان کریں گی۔“

یہ بات نہ جانے کیسے پاٹلی پُتر کے لوگوں تک پہنچ گئی کہ حلوائی کے مقدمے میں وہ

انسانی کھوپڑیاں خود گواہی دیں گی جو حلوائی کے تہہ خانے سے بر آمد ہوئی ہیں۔ چنانچہ اگلے دِن راج محل کا وہ دربارِ عام جِس کی چھت بہت ستونوں پر قائم تھی، لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔

مقرّرہ وقت پر چندر گُپت نے عدالت کی کُرسی سنبھالی اور حلوائی اُس کے سامنے پیش ہوا۔ اُس نے اپنا وہی بیان دُہرایا جو وہ اِس سے سے پہلے دے چُکا تھا کہ میں تو ایک ایمان دار حلوائی ہوں۔ دُکان کے نیچے کا تہہ خانہ بہت دِنوں سے بند پڑا ہے اور اِس سے جو کھوپڑیاں نکلی ہیں، یہ کِس کی ہیں اور کہاں سے آئی ہیں، اِس کے متعلّق میں کُچھ نہیں جانتا۔“

اِس پر چندر گُپت نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے تُو سچ مچ ان کھوپڑیوں کے متعلّق کُچھ نہ جانتا ہو کہ کِس کِس کی ہیں اور کہاں سے آئی ہیں اِس لیے ہم نے یہ بات اُن کھوپڑیوں سے دریافت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کھوپڑیاں اپنا حال خود کہیں گی۔“

یہ کہہ کر اُس نے سارنگ بابا سے کہا۔ ”سارنگ بابا، یہ کھوپڑیاں باری باری

ہمارے سامنے پیش ہوں۔“

سارنگ بابا اُٹھے اور اِنسانی کھوپڑیوں کے اُس ڈھیر کے پاس جا کھڑے ہوئے جو چندر گُپت کی راج گدّی کے پاس ہی لگا ہوا تھا۔ اُنہوں نے ایک کھوپڑی اُٹھائی، اُس پھونک ماری اور پھر اُسے چندر گُپت کے سامنے ایک اُونچی سی چوکی پر رکھ دیا۔ اِس کے ساتھ ہی دربار میں ایک آواز گونجی اور لوگ چونک سے گئے۔ اِس لیے کہ یہ آواز کہیں اور سے نہیں، خود اُس کھوپڑی کے اندر سے آرہی تھی:

”میرا نام سُندر ہے۔ میں اپنے گاؤں سے محنت مزدوری کے لیے یہاں آیا تھا کہ ایک روز حلوائی کے ہتھّے چڑھ گیا۔ اِس نے مجُھے دُکان کے پچھلے حصّے میں لے جا کر ایک کل دبائی تو میں تہہ خانے میں جا گرا۔ وہاں اِس نے میرا سر تن سے الگ کر کے دھڑ کو جلا کر اُس کی راکھ دریا میں بہا دی اور میرے سر کا مغز نکال کر اپنی مٹھائی میں ملا دیا۔“

آواز بند ہو گئی تو سارنگ بابا نے اُس کھوپڑی کو چوکی سے اُٹھا کر ایک طرف رکھ

دیا۔ پھر کھوپڑیوں کے ڈھیر میں سے ایک اور کھوپڑی اُٹھائی۔ اُس پر پھُونک ماری اور اُس کو چندر گُپت کے سامنے چوکی پر رکھ دیا۔ اِس کے ساتھ ہی ایک آواز گونجی:

”میرا نام نِرمل ہے۔ میں آونتی سے اپنے بھائی سے ملنے کے لیے آیا تھا کہ اِس حلوائی نے مُجھے اپنا شکار بنالیا۔ اِس نے مُجھے ایسی مٹھائی کھلائی جسے کھا کر میں بے ہوش ہوگیا۔ تہہ خانے میں اِس نے میرا سر کاٹا اور دھڑ کو جلا کر دریا میں بہا دیا۔ اِس کے بعد اِس نے میرے سر سے مغز نکالا اور اُسے مٹھائی میں شامل کر لیا۔“

اِس کے بعد تیسری کھوپڑی نے اپنی کہانی سُنائی:

”میرا نام اجیت ہے۔ میں اپنے بیمار باپ کے لیے دوا لینے گاؤں سے یہاں آیا تھا۔ واپس جاتے ہوئے میں نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے اِس حلوائی کی دُکان سے مٹھائی خریدی تو یہ حلوائی مُجھے باتوں میں لگا کر دُکان کے پچھلے حصّے میں لے گیا اور وہاں سے اُس نے ایک کل دبا کر مُجھے تہہ خانے میں پہنچا دیا۔ وہاں اِس

نے میرا سر کاٹا، دھڑ کو جلا کر دریا میں بہایا اور میرے سر سے مغز نکال کر ایک مٹھائی میں ملا دیا۔"

کھوپڑیاں ایک ایک کر کے اپنی داستان بیان کرتی جا رہی تھیں۔ سُننے والے یُوں سُن رہے تھے جیسے سُن ہو کر رہ گئے ہوں۔ یہ سب داستانیں قریب قریب ایک جیسی تھیں۔ وہی لوگ اُس حلوائی کا شکار بنے تھے جو باہر کے رہنے والے تھے۔ کوئی کہیں سے آیا تھا اور کوئی کہیں سے۔ کوئی پاس کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا اور کوئی دُور کے کسی شہر کا باسی تھا۔ کوئی کسی کام تھا اور کوئی کسی کام سے۔ اور یہ سب حلوائی کے خوف ناک کاروبار کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ وہ اُن سب کے دھڑ جلا جلا کر دریا میں پھینکتا گیا تھا اور اُن کے سروں سے مغز نکال کر اپنی مٹھائیوں میں ملاتا گیا تھا۔ آج پاٹلی پُتر والوں کو مٹھائی کے نام پر اُنھیں کیا کُچھ کھلاتا رہا ہے۔

کھوپڑیاں اپنی اپنی آپ بیتی کہہ رہی تھیں اور انہیں سُن سُن کر حلوائی کا رنگ اُڑتا

جارہا تھا۔

ایک کھوپڑی کی داستان نے سب کو اپنی طرف متوجّہ کر لیا۔ یہ ایک عورت کی کھوپڑی تھی۔ اُس نے کہا:

"میرا نام چِتر وتی ہے، اور میری بڑی بہن کا نام سُندری تھا۔ یہ وہی سُندری تھی جِس نے شیش ناگ کی واحد نشانی کو مٹنے سے بچانے کی خاطر اپنے جگر کا ٹکڑا قربان کر دیا تھا۔ جب راجا سُدھانند نے شیش ناگ خاندان کے مردوں کو چُن چُن کر قتل کرانا شروع کیا تو چندر گُپت میری بہن کی گود میں تھا اور جب راجا سُدھانند کے آدمی چندر گُپت کی تلاش میں آئے تو میری بہن نے اپنے بیٹے کو چندر گُپت بنا کر اُن کے حوالے کر دیا۔ اِس وقت شیش ناگ خاندان کے ایک وفادار وزیر پر تامی نے راجا سُدھانند کے خوف سے بھاگ کر تھانیسر کے قلعے میں پناہ لے لی تھی۔ سُدھانند کے ایک سپہ سالار بودھ شنکر نے اُس قلعے پر حملہ کر کے پر تامی کو قتل کر ڈالا تھا۔

پرتامی کی ایک بچّی تھی، اور میں اُس بچّی کی دائی تھی۔ تھانیسر جانے سے پہلے پرتامی نے مُجھے یہ ہدایت کی تھی کہ میں اِس بچّی کو اُس کی ننھیال اجودھیا پہنچا دُوں۔ پرتامی خود تو بھاگ کر تھانیسر چلا گیا تھا اور وہاں بُودھ شنکر کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا، مگر اُس کی بچّی میرے پاس پاٹلی پُتر میں ہی تھی۔ میں اُس بچّی کو لے کر گھر سے نکلی تو اتّفاق سے چند سپاہی میرے پیچھے لگ گئے۔ شاید انہیں پتا چل گیا تھا کہ میری گود میں جو بچّی ہے، وہ شیش ناگ خاندان کے وفادار وزیر پرتامی کی ہے۔ میں سپاہیوں کے خوف سے بھاگی تو اِس حلوائی نے مُجھے اشارہ کیا کہ میں دُکان کے پچھلے حصّے میں جا کر چھُپ جاؤں۔ میں اُس کی نیّت نیک سمجھتے ہوئے دُکان پچھلے حصّے میں چلی گئی۔ میرا خیال تھا کہ جب سپاہی چلے جائیں گے تو میں دُکان سے نِکل کر کسی اور راستے باہر چلی جاؤں گی۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ جس شخص کی نیک نیّتی کے بھروسے میں دُکان کے پچھلے حصّے میں آ گئی تھی اور جسے میرا دِل دُعائیں دے رہا تھا، اُس نے ایک تازہ شکار پھانسا ہے۔ میں ابھی دُکان سے نکلنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اِس حلوائی نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کوئی کل دبائی،

کھٹاک کی سی آواز آئی، میرے پیروں کے نیچے سے ایک تختہ سِرکا اور میں بچّی سمیت تہہ خانے میں جاگری۔ وہاں اِس ظالم نے پہلے تو بیٹی کو مُجھ سے چھین لیا اور پھر میرا سر دھڑ سے الگ کر ڈالا، دھڑ کو اِس نے جلا کر دریا میں بہا دیا اور میرے سر کا مغز نکال اپنی مٹھائی میں ملا لیا۔ مُجھے اپنے اِس دردناک انجام کا کوئی افسوس نہیں ہے کہ شاید میرے بھاگ میں یہی کُچھ تھا مگر افسوس ہے تو اِس بات کا کہ میں اپنی بہن کی طرح سُرخ رُو نہ ہو سکی۔ میری بہن نے اپنے بیٹے کی قربانی دے کر چندر گُپت کو بچا لیا، مگر میں ایسی بدقسمت تھی کہ اپنے آقا کی بیٹی کو اُس کی ننھیال بھی نہ پہنچا سکی۔ نہ جانے اُس ظالم نے اُس بچّی کا کیا کِیا، کون جانے وہ اِس دُنیا میں ہے بھی یا نہیں!"

چِتر وتی کی اِس درد بھری داستان نے سُننے والوں کے دِل دہلا دیے۔ اپنی جگہ پر کھوپڑی کی داستان دردناک تھی مگر چِتر وتی کی کھوپڑی نے جو کُچھ کہا، اُسے سُن کر بہت سے لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ چندر گُپت کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا۔ اُس نے کڑک کر حلوائی سے کہا:

”او کم بخت! ہمیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ تُو اِتنا ظالم اور پتھّر دِل ہو سکتا ہے، تُو نے خُدا کے سینکڑوں بے گناہ بندوں کو اپنے لالچ کی خاطر قتل کیا۔ تُو کِس ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا کہ مجُھے اِن کھوپڑیوں کے متعلّق کُچھ عِلم نہیں۔ دیکھ! اِن کھوپڑیوں نے تیرے خلاف گواہی دی ہے، اور تیری سزا یہ ہے کہ اِس شہر کے وہ لوگ تُجھے پتھّر مار مار کر ہلاک کر ڈالیں جِن کو تُو مٹھائی کے نام پر اُن کے بھائی بندوں کا مغز کِھلاتا رہا ہے۔“

یہ سزا سُن کر حلوائی کا رنگ پیلا پڑ گیا، کُچھ کہنے ہی والا تھا کہ چندر گُپت بولا:

”مگر اِس سے پہلے کہ اِس سزا پر عمل ہو، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تُو نے پر تامی کی اُس بچّی کا کیا کِیا جو چِتر وتی کے ساتھ تھی؟ وہ بچّی کہاں ہے؟“

حلوائی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور سر سے پاؤں تک کانپتے ہوئے کہا۔ ”وہ زندہ ہے مہاراج! میری بیوی نے اُسے گود لے لیا تھا۔ یشودھا وہی بچّی ہے۔“

یہ چندر گُپت اور چانکیہ کے لیے ہی نہیں، خود یشودھا کے لیے بھی بہت بڑا

انکشاف تھا کہ جِس کو اب تک وہ اپنا باپ سمجھتی اور کہتی آئی تھی، وہ حقیقت میں اُس کی مہربان دائی کا قائل تھا۔ وہ اُس حلوائی کی نہیں، شیش ناگ خاندان کے وفادار وزیر پرتامی کی بیٹی تھی۔

اب، کسی اور کارروائی کی ضرورت نہ تھی۔ کھوپڑیوں کی گواہی نے انصاف کے تقاضے پورے کر دیے۔ اگلے ہی دِن حلوائی کو ایک کھُلے میدان میں ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا اور پھر پاٹلی پُتر کے اُن ہی لوگوں نے اُسے پتھّر مار مار کر مار ڈالا جو کبھی اُس کی مٹھائی کے خریدار تھے اور جنھیں وہ مٹھائی کی آڑ میں انسانی مغز کھِلاتا تھا۔ اُس پر سب سے پہلا پتھّر اُس یشودھا نے مارا تھا جِسے اُس نے چِترو تی کی گود سے چھینا تھا۔

اور اُس کے چند روز بعد ہی یشودھا چندر گُپت کی دوسری رانی بن گئی۔

چانکیہ کی کتاب

چندر گُپت کے مگدھ کی راج گدّی حاصل کرنے میں جہاں اُس کی اپنی حوصلہ مندی اور دلیری کو دخل تھا، وہاں اُس میں چانکیہ کی غیر معمولی چالاکی اور دانائی کا بھی ہاتھ تھا۔ چانکیہ کی ذہانت اور چالاکی نے قدم قدم پر چندر گُپت کی رہنمائی کی تھی۔ اُس کا احساس چندر گُپت کو بھی تھا اور خود چانکیہ کو بھی۔ اور اب کہ چندر گُپت کے قدم مضبوطی سے جم چُکے تھے، چانکیہ حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے چندر گُپت کی رہنمائی کرنا چاہتا تھا، وہ اُس کے سامنے حکومت کے کاروبار کا ایک ایسا خاکہ رکھنا چاہتا تھا جِس میں وہ اپنی حوصلہ مندی اور دلیری سے رنگ بھر

سکے۔ اُس کے سامنے حکومت کے ایسے اصول رکھنا چاہتا تھا جِن پر وہ عمل کر کے دُنیا میں اپنے نام اور اپنے کام کا ڈنکا بجا سکے۔

چانکیہ کو شروع دِن ہی سے اِس کام کا خیال تھا۔ اُس کا اپنا ذہن ہی دانائی اور چالاکی کا ایسا سمندر تھا جس کی کوئی اتھاہ نہ تھی، مگر اُس نے وہ تمام کتابیں پڑھی تھیں جِن میں عقل، دانائی اور راج پاٹ کی باتیں درج تھیں، جو مختلف وقتوں میں مختلف عالموں نے مختلف راجاؤں کو بتائی تھیں۔ اور اب عقل اور دانائی کے اِس تمام خزانے کے ساتھ وہ اپنی عقل اور ذہانت شامل کر کے چندر گُپت کے لیے راج پاٹ کے ایسے اصول بنانا چاہتا تھا جو چندر گُپت کے لیے ہی نہیں، اُس کے بعد کے راجاؤں کے کام بھی آ سکیں۔

چانکیہ برابر اِس کام میں لگا ہوا تھا۔ حلوائی کے واقعے کے بعد اُس نے اپنی ساری توجّہ اِس کام پر لگا دی اور دِن رات ایک کر کے وہ کتاب لکھی جِس کا نام اُس نے اَرتھ شاستر رکھا تھا۔

اِس کتاب کے دس باب تھے۔ پہلے باب میں بتایا گیا تھا کہ شہزادوں اور خاص طور سلطنت کے ولی عہد کی پرورش کِس طرح کرنی چاہیے اور اُس کے دوسرے باب میں بادشاہ اور راجا کے روز مرّہ فرائض بیان کیے گئے تھے۔ ایک اور باب میں بتایا گیا تھا کہ راجا کو اپنے وزیروں کا بچاؤ کرتے وقت کیا کیا باتیں سامنے رکھنی چاہئیں، اور اُسے وزیروں کی وفاداری اور دیانت داری کا امتحان کیسے لینا چاہیے۔ راجا کو دیکھنا چاہیے کے وزیروں کو اپنے مذہب سے کس قدر لگاؤ ہے؟ اُنہیں دولت سے کتنا پیار ہے اور عیش و عشرت کو کتنا پسند کرتے ہیں اور خوف اور خطروں سے کسی حد تک اثر قبول کرتے ہیں۔ اُس کے وزیر ایسے ہونے چاہئیں جو اِن چار باتوں میں اعلیٰ اخلاق اور مضبوط کردار کے مالک ہوں۔

اَرتھ شاستر کے ایک اور باب میں بیان کیا گیا تھا کہ راجا کو حکومت کا نظام چلانے کے لیے کون کون سے محکمے قائم کرنے چاہئیں اور اُن کا انتظام کیسے کرنا چاہیے، کیسے کیسے لوگوں کو اُن محکموں کے چلانے پر مقرّر کرنا چاہیے۔ پھر ایک اور باب میں بتایا گیا تھا کہ رعایا سے محصول اور لگان وغیرہ کیسے وصول کرنا چاہیے۔ ایک

اور باب میں انصاف کے طریقوں سے بحث کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ رعایا کے ساتھ انصاف کرنے میں کیا کیا اصول سامنے رکھنے چاہئیں، اور اِس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ہر قسم کی سزائیں بغیر کسی نرمی یا رعایت کے دی جانی چاہیں۔ اَر تھ شاستر کے ایک اور باب میں بتایا گیا تھا کہ راجا کو اپنے پڑوسی راجاؤں سے کیسے تعلّقات رکھنے چاہئیں۔ اِس میں اِس بات پر زور دیا گیا تھا کہ راجا کو اپنے پڑوسی راجا کو اپنا دُشمن سمجھنا چاہیے لیکن اُس پڑوسی کے پڑوسی راجا کے ساتھ دوستی اختیار کرنی چاہیے۔

ایک اور باب میں مضبوط فوجی نظام قائم کرنے پر زور دیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ فوج کے مختلف حصّوں مثلاً پیادہ فوج، گھُڑسوار فوج، جنگی ہاتھی، جنگی رتھ، بحری فوج اور جنگی بار برداری کا انتظام کرنے کے لیے کیا کیا طریقے ضروری ہیں۔

ایک اور باب میں جاسوسی نظام کی اہمیّت بیان گئی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ راجا اپنی رعایا کے حالات سے اُسی طور پر باخبر رہ سکتا ہے جب سلطنت کے چپّے چپّے میں

اُس کے جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا ہو۔ اُن جاسوسوں کے ذریعے وہ اپنی حکومت کے چھوٹے بڑے عہدے داروں پر بھی نظر رکھ سکے گا۔

اَرتھ شاستر کے ایک حصّے میں یہ بتایا گیا تھا کہ راجا کو اپنے دُشمنوں کو زیر کرنے کے لیے کیا کُچھ کرنا چاہیے۔ اِس میں بتایا گیا تھا کہ راجا ہر قانون اور ہر اصول سے اُونچا ہے۔ وہ اپنے مطلب اور مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جائز، ناجائز، اخلاقی غیر اخلاقی ہر ترکیب پر عمل کر سکتا ہے۔

اَرتھ شاستر میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ راجا کو جہاں تک ہو سکے، اپنے دُشمن کے خلاف میدانِ جنگ میں کودنے سے بچنا چاہیے، اِس کے بجائے ایسے طریقے اختیار کرنا چاہئیں جِن سے دُشمن کمزور ہو جائے اور اِس طرح جنگ کیے بغیر اُس پر فتح حاصل کی جا سکے۔

یہ تھا اَرتھ شاستر جو چانکیہ نے چندر گُپت کی رہ نمائی کے لیے لکھا تھا۔ چانکیہ نے اِس میں وہ وہ باتیں کہی تھیں جو بھیشم، پورس تک کوئی سورما سوچ بھی نہیں سکتا

تھا۔ اُس نے راجا کو ہر قانون، ہر اخلاق سے اُونچا قرار دے دیا تھا۔ اُس کے نزدیک راجا اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سب کُچھ کر سکتا تھا۔ جھُوٹ بھی بول سکتا تھا، دھوکا بھی دے سکتا تھا، وقت اور موقع محل دیکھ کر کبھی لومڑی کی طرح چالاک اور کبھی چیتے کی طرح دلیر بھی بن سکتا تھا۔

اور جس روز چانکیہ نے یہ اَرتھ شاستر چندر گُپت کو پیش کیا، اُسی روز سارنگ بابا نے چندر گُپت سے کہا:

"شیش ناگ کے بیٹے! ہم صرف اِس لیے یہاں آئے تھے کہ تُجھے اپنے خاندان کا کھویا ہوا راج پاٹ مل سکے، تُجھے مگدھ کی راج گدّی مل گئی ہے، تیرے راستے کا ہر کانٹا دور ہو چکا ہے، اب تُجھے یہاں راج کرنا ہے۔ تُو راج کر اور ہم یہاں سے رُخصت ہوتے ہیں۔"

چندر گُپت نے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن سارنگ بابا کے نزدیک اب ہمارا وہاں رہنا بالکل غیر ضروری تھا۔ چنانچہ چند دِن بعد ہی ہم، سارنگ بابا میں اور

اُوشا، پاٹلی پُتر سے چل دیے۔ اب ہمارا رُخ شمال کی طرف تھا۔ سارنگ بابا نیپال کے راستے ہوتے ہوئے کشمیر واپس جانا چاہتے تھے۔

نیپال میں انومہ ندی کے کنارے جگ موہن رشی کی کُٹیا میں سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا نے کیا دیکھا۔ پُشپا کون ہے اور وہ ناگن کے روپ میں کیسے آئی؟

کپل وستو اصل میں کون تھا: اِندرا اور رِبندرا کا جادُو کیا تھا۔ کانگ مار کی سپیرن چندرا اور دھولا گری کی راج کُماری چندرا کا ماجرا کیا تھا؟

یہ سب واقعات جاننے کے لیے انوشا کی آپ بیتی کا چھٹا حصّہ "انوشا نیپال میں" پڑھیے۔